دین حق

دین حق

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

مطبوعاتِ اشاعتِ اسلام ٹرسٹ ۲۲۴

دینِ حق

از

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

مرکزی مکتبۂ اسلامی دہلی ۶

بار ہفتم ...... دو ہزار

مطبوعہ

جمال پرنٹنگ پریس، دہلی

مارچ ۱۹۷۵ء

قیمت ...... ۷۵ پیسے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دینِ حق

(یہ خطبہ ۲۱ مارچ ۱۹۴۳ء کو جامعہ ملیہ دہلی میں دیا گیا تھا)

قرآن جس دعوے کے ساتھ نوعِ انسانی کو اپنے پیش کردہ مسلک کی طرف دعوت دیتا ہے وہ خود اس کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:-

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ط

یہی ذرا سا فقرہ میری اس تقریر کا موضوع ہے۔ زیادہ تفصیل کا موقع نہیں، بہت اختصار کے ساتھ میں پہلے اس کے معنی کی تشریح کروں گا، جس سے واضح ہو جائے گا کہ اس فقرے میں دراصل کس چیز کا دعویٰ کیا گیا ہے، پھر اس سوال پر

بحث کروں گا کہ یہ دعویٰ تسلیم کیا جانا چاہیئے یا نہیں اور آخر میں یہ بیان کروں گا کہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس تسلیم کرنے کے مقتضیات کیا ہیں۔

عموماً اس فقرے کا جو سیدھا سادھا مفہوم بیان کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ "سچا مذہب تو اللہ کے نزدیک بس اسلام ہی ہے" اور "اسلام" کا جو تصور عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ہے، وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ ایک مذہب کا نام ہے، جو اب سے تیرہ سو برس (۱۳۰۰) پہلے عرب میں پیدا ہوا تھا اور جس کی بنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈالی تھی ——— "بنا ڈالی تھی" کا لفظ میں قصداً اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ صرف غیر مسلم ہی نہیں، بلکہ بکثرت مسلمان اور اچھے خاصے ذی علم مسلمان، بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو "بانیِ اسلام" کہتے اور لکھتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک اسلام کی ابتدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہوئی ہے، اور آپ ہی اس کے بانی ہیں۔ لہٰذا جب ایک غیر مسلم قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے اس فقرے پر پہنچتا ہے، تو وہ یہ گمان کر کے سرسری طور پر اس سے گذر جاتا ہے کہ جس طرح ہر مذہب صرف اپنے ہی برحق ہونے اور دوسرے مذہبوں کے باطل ہونے کا مدعی ہے، اسی طرح قرآن نے بھی اپنے پیش کردہ مذہب کے برحق ہونے کا دعویٰ کر دیا ہے، اور جب ایک مسلمان اسے پڑھتا ہے تو وہ اس وجہ سے اس پر غور کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھتا کہ جس مذہب کو اس فقرے میں برحق کہا گیا ہے،

اسے وہ خود بھی برحق مانتا ہے۔ یا اگر غور و فکر کے لئے، اس کے ذہن میں کوئی تحریک پیدا ہوتی بھی ہے تو وہ بالعموم یہ رُخ اختیار کر لیتی ہے کہ عیسائیت ہندو مت، بودھ مت اور ایسے ہی دوسرے مذاہب سے اسلام کا مقابلہ کر کے اس کی حقانیت ثابت کی جائے۔ لیکن درحقیقت قرآن میں یہ مقام ایسا ہے جس پر ایک سنجیدہ طالب علم کو ٹھہر کر بہت غور کرنا چاہیے۔ اس سے زیادہ غور کرنا چاہیے جتنا اب تک اس پر کیا گیا ہے۔

قرآن کے اس دعویٰ کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے "اَلدِّیْن" اور "اَلاِسلَام" کا مفہوم متعین کر لینا چاہیے۔

اَلدِّیْن کا مفہوم

عربی زبان میں لفظ "دین" کئی معنوں میں آتا ہے، اس کے ایک معنی غلبہ اور اقتدار کے ہیں۔ دوسرے معنی اطاعت و غلامی کے ہیں، تیسرے معنی جزا اور بدلے کے، چوتھے معنی طریقہ اور مسلک کے، یہاں یہ لفظ اسی چوتھے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی دین سے مراد وہ طریق زندگی یا طرزِ فکر و عمل ہے کہ جس کی پیروی کی جائے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ قرآن محض دین نہیں کہہ رہا ہے بلکہ اَلدّین کہہ رہا ہے، اس کے معنی میں وہی فرق واقع ہو جاتا ہے جو انگریزی زبان

میں This is the way کہنے کے بجائے This is a way کہنے سے واقع ہوتا ہے۔ یعنی قرآن کا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ اللہ کے نزدیک اسلام ایک طریقِ زندگی ہے، بلکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام ہی ایک حقیقی اور صحیح طریقِ زندگی یا طرزِ فکر و عمل ہے۔

پھر یہ بھی ذہن نشین رہے کہ قرآن اس لفظ کو کسی محدود معنی میں استعمال نہیں کرتا بلکہ وسیع ترین معنی میں استعمال کرتا ہے۔ طریقِ زندگی سے اس کی مراد زندگی کے کسی خاص پہلو یا کسی خاص شعبہ کا طریق نہیں، بلکہ پوری زندگی کا طریق ہے، الگ الگ، ایک ایک شخص کی انفرادی زندگی ہی کا طریق نہیں، بلکہ بحیثیت مجموعی سوسائٹی کا طریق بھی ہے۔ ایک خاص ملک یا ایک خاص قوم یا ایک خاص زمانے کی زندگی کا طریق نہیں، بلکہ تمام زمانوں میں تمام انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا طریق ہے۔ لہٰذا قرآن کے دعویٰ کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اللہ کے نزدیک پوجا پاٹ اور عالمِ بالا کے اعتقاد اور حیات بعد الممات کے تصور کا ایک صحیح مجموعہ وہی ہے جس کا نام اسلام ہے، نہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ افرادِ انسانی کے مذہبی طرزِ خیال و عمل کی (جیسا کہ لفظ "مذہبی" کا مفہوم آج کل کی مغربی اصطلاح میں لیا جاتا ہے) ایک صحیح صورت وہی ہے، جسے اسلام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ عرب کے

لوگوں، یا فلاں صدی تک کے انسانوں، یا فلاں دور مثلاً صنعتی انقلاب سے پہلے تک کے آدمیوں کے لئے، ایک صحیح نظامِ زندگی وہی ہے، جس کو اسلام سے موسوم کیا گیا ہے۔ بلکہ صریح طور پر اس کا دعویٰ یہ ہے کہ "ہر زمانہ اور ہر دور میں پوری نوعِ انسانی کے لئے زمین پر زندگی بسر کرنے کا ایک ہی ڈھنگ اللہ کے نزدیک صحیح ہے اور وہ ڈھنگ وہی ہے جس کا نام اَلْاِسْلَام ہے۔"

مجھے یہ سُن کر تعجب ہوا کہ ایشیا اور یورپ کے درمیان کسی مقام پر قرآن کی کوئی تفسیر کی گئی ہے جس کی رو سے "دین" کا مفہوم صرف بندے اور خدا کے انفرادی تعلق تک محدود ہے، اور تمدن اور سیاست کے نظام سے اس کا کوئی علاقہ نہیں ہے[1]۔ یہ تفسیر اگر خود قرآن سے اخذ کی گئی ہے، تو یقیناً بڑی دلچسپ چیز ہوگی، لیکن میں نے اٹھارہ سال تک قرآن کا جو تحقیقی مطالعہ کیا ہے، اس کی بنا پر میں بلا خوفِ تردید کہتا ہوں کہ قرآن اپنے تمام جدید مفسرین کی خواہشات کے علی الرغم "اَلدِّین" کے لفظ کو کسی محدود معنی میں استعمال نہیں کرتا،

---

[1] اشارہ ہے ترکی اخبار نویسوں کے اس وفد کی طرف جو ۱۹۴۳ء میں ہندوستان آیا تھا اور جس کے صدرِ وفد نے یہاں ان خیالات کا اظہار کیا تھا ۱۲

بلکہ اس سے تمام زمانوں کے تمام انسانوں کے لئے ان کی پوری زندگی کا نظامِ فکر و عمل مراد لیتا ہے۔

اَلاِسلَام کا مفہوم

اب لفظ "اسلام" کو لیجئے۔ عربی زبان میں اس کے معنی ہیں سپر ڈال دینا، جھک جانا، اطاعت قبول کر لینا، اپنے آپ کو سپرد کر دینا، مگر قرآن محض "اسلام" نہیں بولتا بلکہ اَلاِسْلَام بولتا ہے ۔ جو اس کی خاص اصطلاح ہے۔ اس مخصوص اصطلاحی لفظ سے اس کی مراد خدا کے آگے جھک جانا، اس کی اطاعت قبول کر لینا، اس کے مقابلے میں اپنی آزادی سے دست بردار ہو جانا، اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینا ہے۔ اس تسلیم و اطاعت اور سپردگی و حوالگی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قانونِ طبیعت (LAW OF NATURE) کے آگے سپر ڈال دی جائے۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے اس کا مفہوم قرار دینے کی کوشش کی ہے، نہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے تخیّل یا اپنے مشاہدات و تجربات سے خدا کی مرضی اور اس کے منشاء کا جو تصور بطور خود اخذ کر لے، اسی کی اطاعت کرنے لگے، جیسا کہ اور لوگوں نے غلطی سے سمجھ لیا ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے خود اپنے رسولوں کے ذریعے سے انسان کے لئے جس طریقِ فکر و عمل

کی طرف رہنمائی کی ہے ، اس کو قبول کرلے ، اور اپنی آزادیٔ فکر و عمل ـــــــ یا بالفاظِ صحیح ترآوارگیٔ فکر و عمل ـــــــ چھوڑ کر اس کی پیروی و اطاعت اختیار کرلے ۔ اسی چیز کو قرآن "اَلْاِسْلَامُ" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے اور یہ درحقیقت کوئی جدید العہد مذہب نہیں ہے جس کی بنا اب سے ۱۳۶۳ برس پہلے عرب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈالی ہو، بلکہ جس روز پہلی مرتبہ اس کرۂ زمین پر انسان کا ظہور ہوا اسی روز خدا نے انسان کو بتا دیا تھا کہ تیرے لئے صرف یہ "اَلْاِسْلَامُ" ہی ایک صحیح طرزِ عمل ہے اور اس کے بعد دُنیا کے مختلف گوشوں میں وقتاً فوقتاً جو پیغمبر بھی خدا کی طرف سے انسانوں کی رہنمائی کے لئے مامور ہوئے ہیں، ان سب کی دعوت بھی بلا استثناء اسی "اَلْاِسْلَام" ہی کی طرف رہی ہے ، جس کی طرف بالآخر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو دعوت دی ۔ یہ اور بات ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے پیرووں نے بعد میں بہت سی مختلف چیزوں کی آمیزش کرکے ایک نظام یہودیت کے نام سے ، اور مسیح علیہ السلام کے پیرووں نے ایک دوسرا نظام مسیحیت کے نام سے ، اور اسی طرح ہندوستان ، ایران ، چین اور دوسرے ممالک کے پیغمبروں کی اُمتوں نے مختلف مخلوط و مرکب نظامات دوسرے

ناموں سے بنالئے ہوں۔ لیکن موسیٰؑ اور مسیحؑ اور دوسرے تمام معروف وغیر معروف انبیاء علیہم السلام، جس دین کی دعوت دینے آئے تھے، وہ خالص اسلام تھا، نہ کہ کچھ اور۔

قرآن کا دعویٰ کیا ہے

اس تشریح کے بعد قرآن کا دعویٰ بالکل صاف اور واضح صورت میں ہمارے سامنے آجاتا ہے اور وہ یہ ہے:

"نوعِ انسان کے لئے خدا کے نزدیک صرف ہی ایک صحیح طریقِ زندگی ہے کہ وہ خدا کے آگے سرِ تسلیم خم کردے، اور فکر و عمل کی اس راہ پر چلے جس کی طرف خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے رہنمائی کی ہے۔"

یہ ہے قرآن کا دعویٰ۔ اب ہمیں یہ تحقیق کرنا ہے کہ کیا یہ دعویٰ قبول کیا جانا چاہیے۔ خود قرآن نے اپنے اس دعوے کی تائید میں جو دلائل قائم کئے ہیں، ان پر ہم غور کریں گے ہی۔ مگر کیوں نہ اس سے پہلے خود اپنی جگہ تلاش و تجسّس کرکے یہ دریافت کرلیں کہ ہمارے لئے اس دعوے کو قبول کرنے کے سوا کوئی اور چارۂ کار بھی ہے۔

"طریقِ زندگی" کی ضرورت

یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں انسان کو زندگی بسر کرنے کے لئے بہر حال ایک طریقِ زندگی درکار ہے جسے وہ اختیار کرے۔ انسان دریا نہیں ہے، جس کا راستہ زمین کے نشیب و فراز سے خود متعین ہو جاتا ہے۔ انسان درخت نہیں ہے جس کے لئے قوانینِ فطرت ایک راہ طے کر دیتے ہیں۔ انسان نرا جانور نہیں ہے، جس کی رہنمائی کے لئے تنہا جبلّت ہی کافی ہو جاتی ہے۔ اپنی زندگی کے ایک بڑے حصے میں قوانینِ طبیعت کا محکوم ہونے کے باوجود انسان زندگی کے بہت سے ایسے پہلو رکھتا ہے، جن میں اسے کوئی لگا بندھا راستہ نہیں ملتا کہ حیوانات کی طرح بے اختیار اس پر چلتا رہے۔ بلکہ اس کو اپنے انتخاب سے خود ایک راہ اختیار کرنی پڑتی ہے، اس کو فکر کی ایک راہ چاہیے، جس سے وہ اپنے اور کائنات کے اُن بہت سے مسائل کو حل کرے، جنھیں فطرت اس کے سوچنے والے دماغ کے سامنے پیش کرتی ہے، مگر ان کا کوئی حل غیر مشتبہ زبان میں نہیں بتاتی۔ اس کو علم کی ایک راہ چاہیے، جس پر وہ ان معلومات کو منظّم کرے، جنھیں فطرت اس

کے حواس کے ذریعے سے اس کے ذہن تک پہنچاتی ہے۔ مگر انہیں بطور خود منظم کر کے اس کے حوالے نہیں کر دیتی۔ اس کو شخصی برتاؤ کے لئے ایک راہ چاہیئے، جس پر وہ اپنی ذات کے بہت سے ان مطالبات کو پورا کرے، جن کے لئے فطرت تقاضا کرتی ہے، مگر انہیں پورا کرنے کا کوئی مہذب طریقہ معین کر کے نہیں دیتی۔ اس کو گھریلو زندگی کے لئے، خاندانی تعلقات کے لئے، معاشی معاملات کے لئے، ملکی انتظام کے لئے، بین الاقوامی ربط و تعلق کے لئے اور زندگی کے بہت سے دوسرے پہلوؤں کے لئے بھی، ایک راہ درکار ہے، جس پر وہ محض ایک شخص کی حیثیت ہی سے نہیں، بلکہ ایک جماعت، ایک قوم، ایک نوع کی حیثیت سے بھی چلے، اور ان مقاصد تک پہنچ سکے جو اگرچہ فطرۃً اس کے مطلوب و مقصود ہیں، مگر فطرت نے نہ تو ان مقاصد کو صریح طور پر اس کے سامنے نمایاں کیا ہے، اور نہ ان تک پہنچنے کا ایک راستہ معین کر دیا ہے۔

زندگی کا انقسام پذیر نہ ہونا

زندگی کے یہ مختلف پہلو، جن میں کوئی ایک طریق اختیار کرنا انسان کے لئے ناگزیر ہے، بجائے خود مستقل اور ایک دوسرے سے بے نیاز

شعبے یا محکمے نہیں ہیں کہ ان میں ہر ایک کے لئے آدمی الگ الگ راہیں اختیار کر سکتا ہے، جن کی سمتیں الگ ہوں، جن کے زادِ راہ الگ ہوں، جن پر چلنے کے ڈھنگ اور انداز الگ ہوں، جن کی راہ نوردی کے مقتضیات الگ ہوں، اور جن کی منازلِ مقصود الگ ہوں۔ انسان اور اس کی زندگی کے مسائل کو سمجھنے کی ایک ذرا سی دانش مندانہ کوشش ہی آدمی کو اس پر مطمئن کرنے کے لئے کافی ہے کہ زندگی بہ حیثیتِ مجموعی ایک ہے۔ جس کا جُز دوسرے جُز سے اور ہر پہلو دوسرے پہلو سے، گہرا ربط رکھتا ہے۔ ایسا ربط رکھتا ہے جو توڑا نہیں جا سکتا۔ ہر ایک دوسرے پر اثر ڈالتا ہے اور اس سے اثر قبول کرتا ہے۔ ایک ہی خون سب رگوں میں گردش کرتا ہے۔ ایک ہی رُوح سب میں سرایت کئے ہوئے ہوتی ہے اور سب مل کر وہ چیز بناتے ہیں جسے انسانی زندگی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا فی الواقع جو چیز انسان کو درکار ہے وہ زندگی کے مقاصد نہیں، بلکہ مقصد ہے، جس کے ضمن میں سارے چھوٹے بڑے مقاصد پوری موافقت کے ساتھ اپنی اپنی جگہ لے سکیں۔ اور جس کے حصول کی کوشش میں وہ سب حاصل ہو جائیں، اس کو راستے نہیں بلکہ راستہ درکار ہے، جس پر وہ اپنی پوری زندگی کو اس کے تمام پہلوؤں سمیت، کامل ہم آہنگی کے ساتھ اپنے

مقصودِ حیات کی طرف لے چلے۔ اس کو فکر، علم، ادب، آرٹ، تعلیم، مذہب، اخلاق، معاشرت، معیشت، سیاست، قانون وغیرہ کے لئے الگ الگ نظامات نہیں، بلکہ ایک جامع نظام درکار ہے، جس میں یہ سب ہمواری کے ساتھ سموئے جا سکیں، جس میں ان سب کے لئے ایک ہی مزاج اور ایک ہی طبیعت رکھنے والے مناسب اصول موجود ہوں، اور جس کی پیروی کر کے آدمی اور آدمیوں کا مجموعہ اور من حیث الکل پوری آدمیت، اپنے بلندترین مقصود تک پہنچ سکے۔ وہ جاہلیت کا تاریک دور تھا، جب زندگی کو مستقل جداگانہ شعبوں میں تقسیم کرنا ممکن خیال کیا جاتا تھا۔ اب اگر کچھ لوگ اس طرزِ خیال کی مہمل گفتگو کرنے والے موجود ہیں، تو وہ بے چارے یا تو اخلاص کے ساتھ پرانے خیالات کی فضا میں اب تک سانس لے رہے ہیں، اس لئے قابلِ رحم ہیں، یا پھر وہ ظالم حقیقت کو خوب جانتے ہیں، مگر جان بوجھ کر یہ گفتگو صرف اس لئے کر رہے ہیں کہ جس "دین" کو وہ کسی انسانی آبادی میں رائج کرنا چاہتے ہیں[1] اس کے اصولوں سے اختلاف رکھنے

---

[1] یعنی دینِ قومیت، جس میں خدا اور کتاب اور رسالت سے بے تعلق ہو کر خالص دنیوی مادّی بنیادوں پر ایک مملکت کے باشندوں کے لئے ایک نظامِ زندگی بنایا جائے

والوں کو انہیں یہ اطمینان دلانے کی ضرورت ہے کہ ہمارے اس دین کے تحت تمہیں زندگی کے فلاں فلاں شعبوں میں، جو بدقسمتی سے تم کو عزیز تر ہیں، پورا تحفظ حاصل رہے گا۔ حالانکہ یہ تحفظ عقلاً محال، فطرۃً ممتنع، عملاً ناممکن ہے۔ اس طرح کی گفتگو کرنے والے غالباً خود بھی جانتے ہیں کہ یہ ناممکن[1] ہے۔ ہر دینِ غالب زندگی کے تمام شعبوں کو اپنی روح اور اپنے مزاج کے مطابق ڈھال کر ہی رہتا ہے جس طرح ہر کانِ نمک ان تمام چیزوں کو مبدّل بہ نمک کر کے ہی رہتی ہے، جو اس کے حدود میں داخل ہو جائیں۔

زندگی کی جغرافی و نسلی تقسیم

پھر جس طرح یہ بات مہمل ہے کہ انسانی زندگی کو جدا گانہ شعبوں میں تقسیم کر دیا جائے، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ مہمل بات یہ ہے کہ اسے جغرافی حلقوں یا نسلی دائروں میں تقسیم کیا جائے۔ انسان بلاشبہ زمین کے

---

[1] یعنی دین قومیت جس میں خدا اور کتاب اور رسالت سے بے تعلق ہو کر خالص دنیوی مادّی بنیادوں پر مملکت کے باشندوں کے لئے ایک نظامِ زندگی بنایا جائے۔

حصّوں میں پایا جاتا ہے، جن کو دریاؤں نے، پہاڑوں نے، جنگلوں اور سمندروں نے یا مصنوعی سرحدوں نے تقسیم کر رکھا ہے، اور انسان کی بہت سی مختلف نسلیں اور قومیں بھی ضرور پائی جاتی ہیں جن کے درمیان تاریخی، نفسیاتی اور دوسرے اسباب سے انسانیت کے نشوو ارتقاء نے مختلف صورتیں اختیار کی ہیں، لیکن اس اختلاف کو حجت قرار دے کر جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہر نسل، ہر قوم اور ہر جغرافی آبادی کے لئے "دین" یعنی نظامِ زندگی الگ ہونا چاہیئے، وہ سراسر ایک مہمل بات کہتا ہے۔ اس کی محدود نگاہ ظاہر اور عوارض کے اختلافات میں اُلجھ کر رہ گئی، اس ظاہری کثرت کے اندر جوہرِ انسانیت کی وحدت کو وہ نہیں پا سکا۔ اگر فی الواقع یہ اختلاف اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کی بنا پر دین الگ الگ ہونے چاہئیں، تو میں کہوں گا کہ زیادہ سے زیادہ جو اختلافات ایک ملک اور دوسرے ملک، ایک نسل اور دوسری نسل کے درمیان آپ پاتے ہیں ان سب کو جس قدر مبالغے کے ساتھ چاہیں قلم بند کرلیں اور پھر اُن اختلافات کا خالص علمی جائزہ لیں جو عورت اور مرد میں پائے جاتے ہیں، جو ہر انسان اور دوسرے انسان میں پائے جاتے ہیں، جو ایک ہی ماں اور باپ کے دو بچوں میں پائے جاتے ہیں۔ شاید میں مبالغہ نہ کروں گا اگر یہ دعویٰ کروں کہ علمی تحلیل اور تجزیہ میں پہلی قسم کے اختلافات سے یہ دوسری قسم کے

اختلافات بہر حال شدید تر ہی نکلیں گے۔ پھر کیوں نہ کہہ دیجئے کہ ہر فرد کا نظامِ زندگی الگ ہونا چاہیئے؟ مگر جب آپ انفرادی، نسلی، خاندانی کثرتوں کے اندر وحدت کا ایک عنصر اور پائیدار عنصر ایسا پاتے ہیں، جس کی بنیاد پر قوم، وطن یا نسل کا تصور قائم ہو سکتا ہے اور اُس تصور کی بناء پر ایک قوم، یا ایک ملک کی کثیر آبادی کے لئے ایک نظامِ زندگی ہونا ممکن خیال کیا جاتا ہے، تو آخر کس چیز نے آپ کو روک رکھا ہے کہ قومی، نسلی، وطنی کثرتوں کے درمیان ایک بڑی اور بنیادی وحدت کا عنصر آپ نہیں پا سکتے، جس پر انسانیت کا تصور قائم ہو، اور جس کی بناء پر تمام عالمِ انسانی کا ایک دین یا نظامِ زندگی ہونا ممکن خیال کیا جائے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ تمام جغرافی، نسلی اور قومی اختلافات کے باوجود وہ قوانینِ طبعی یکساں ہیں، جن کے تحت انسان دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے، وہ نظامِ جسمانی یکساں ہے جس پر انسان کی تخلیق ہوئی ہے، وہ خصوصیات یکساں ہیں جن کی بناء پر انسان دوسری موجودات سے الگ ایک مستقل نوع قرار پاتا ہے، وہ فطری داعیات اور مطالبات یکساں ہیں جو انسان کے اندر ودیعت کئے گئے ہیں، وہ قوتیں یکساں ہیں جن کے مجموعہ کو ہم نفسِ انسانی کہتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ تمام طبیعی، نفسیاتی، تاریخی

تمدّنی، معاشی عوامل بھی یکساں ہیں، جو انسانی زندگی میں کارفرما ہیں؟ اگر یہ واقعہ ہے ——— اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ واقعہ نہیں ہے ——— تو جو اصول انسان بحیثیتِ انسان کی فلاح کے لئے صحیح ہوں، ان کو عالم گیر ہونا چاہیئے۔ ان کے قومی، یا نسلی یا وطنی ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ قومیں اور نسلیں ان اُصولوں کے تحت اپنی خصوصیات کا اظہار اور جزوی طور پر اپنے معاملاتِ زندگی کا بندوبست مختلف طریقوں سے کرسکتی ہیں اور ان کو ایسا کرنا چاہیئے، مگر انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے، جس صحیح دین یا نظامِ زندگی کی ضرورت ہے، وہ بہر حال ایک ہی ہونا چاہیے، عقل یہ باور کرنے سے انکار کرتی ہے کہ جو چیز ایک قوم کے لئے حق ہو، وہ دوسری قوم کے لئے باطل ہو جائے اور جو ایک قوم کے لئے باطل ہو وہ دوسری قوم کے لئے حق ہو جائے۔

زندگی کی زمانی تقسیم

ان مہملات، اور جدید زمانے کے عالمانہ مہملات میں سے ایک اور بات جو حقیقت کے اعتبار سے مہمل ترین ہے، مگر حیرت ہے کہ بیقینیت کے پورے وثوق کے ساتھ پیش کی جاتی ہے، انسانی زندگی

کی زمانی تقسیم ہے، یعنی کہا جاتا ہے کہ جو نظامِ زندگی ایک دور میں حق ہوتا ہے، وہ دوسرے دور میں باطل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ زندگی کے مسائل و معاملات ہر دور میں بدل جاتے ہیں۔ اور نظامِ زندگی کا حق یا باطل ہونا سراسر ان مسائل و معاملات ہی کی نوعیت پر منحصر ہے۔ یہ بات اسی انسانی زندگی کے متعلق کہی جاتی ہے جس کے متعلق ساتھ ہی ساتھ ارتقاء کی گفتگو بھی کی جاتی ہے، جس کی تاریخ میں کارفرما قوانین بھی تلاش کئے جاتے ہیں، جس کے گذشتہ تجربات سے حال کے لئے سبق اور مستقبل کے لئے احکام بھی مستنبط کئے جاتے ہیں، اور جس کے لئے "انسانی فطرت" نامی ایک چیز بھی ثابت کی جاتی ہے۔

میں پوچھتا ہوں، کیا آپ کے پاس کوئی ایسا آلۂ پیمائش ہے جس سے آپ نوعِ انسانی کی اس مسلسل تاریخی حرکت کے درمیان دور یا زمانے یا عہد کی حد بندیاں کر سکتے ہوں؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ ان حد بندیوں میں سے واقعی کسی ایک خط پر انگلی رکھ کر آپ کہہ سکتے ہوں کہ اس خط کے اس پار جو مسائل زندگی تھے، وہ اس پار آ کر بالکل تبدیل ہو گئے اور جو حالات اس پار تھے وہ اس پار باقی نہیں رہے؟ اگر فی الواقع انسانی سرگزشت ایسے ہی الگ زمانی ٹکڑوں میں منقسم ہے تب یوں سمجھنا چاہیئے کہ ایک ٹکڑا جو گذر چکا ہے وہ بعد والے ٹکڑے

کے لئے محض ایک فضول ولایعنی چیز ہو گیا۔ اس کے گزرتے ہی وہ سب کچھ ضائع ہو گیا جو انسان نے اس حصۂ دہر میں کیا تھا، اس زمانے میں جو تجربات انسان کو ہوئے، وہ بعد والے زمانے کے لئے کوئی سبق اپنے اندر نہیں رکھتے، کیونکہ وہ حالات و مسائل ہی فنا ہو گئے۔ جن میں انسان نے بعض طریقوں کا، بعض اصولوں کا، بعض قدروں کے لئے سعی وجہد کا تجربہ کیا تھا۔ پھر یہ ارتقا، کی گفتگو کیوں؟ یہ قوانینِ حیات کی تلاش کس لئے؟ یہ تاریخی استنباط کس بناء پر؟ جب آپ ارتقار کا نام لیتے ہیں: لامحالہ یہ اس بات کو متضمن ہے کہ وہاں کوئی چیز ضرور ہے، جو تمام تغیرات کا موضوع بنتی ہے، اور ان تغیرات کے اندر اپنے آپ کو باقی رکھتے ہوئے پیہم حرکت کرتی ہے۔ جب آپ قوانینِ حیات پر بحث کرتے ہیں، تو یہ اس بات کو مستلزم ہے کہ ان ناپائیدار حالات میں، ان رواں دواں مظاہر میں، ان بننے اور بگڑنے والی صورتوں میں کوئی پائیدار اور زندہ حقیقت بھی ہے جو اپنی ایک ذاتی فطرت اور اپنے کچھ مستقل قوانین بھی رکھتی ہے۔ جب آپ تاریخی استنباط کرتے ہیں، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تاریخ کے اس طول طویل رستے پر جو مسافر مختلف مرحلوں سے گذرتا ہوا آرہا ہے اور منزلوں پر

منزلیں طے کرتا چلا جارہا ہے، وہ خود اپنی کوئی شخصیت اور اپنا کوئی مستقل مزاج رکھتا ہے جس کے متعلق یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مخصوص حالات میں مخصوص طور پر کام کرتا ہے۔ ایک وقت میں بعض چیزوں کو قبول کرتا ہے اور دوسرے وقت میں انھیں رد کر دیتا ہے اور بعض دوسری چیزوں کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ زندہ حقیقت، یہ پائیدار موضوعِ تغیرات، یہ شاہراہِ تاریخ کا مستقبل مسافر ہی تو ہے، جسے آپ غالباً "انسانیت" کہتے ہیں۔ مگر کیا بات ہے کہ جب آپ راستے کی منزلوں اور ان میں پیش آنے والے حالات، اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل پر گفتگو شروع کرتے ہیں، تو اس گفتگو میں ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ خود مسافر آپ کو یاد نہیں رہتا؟ کیا یہ سچ ہے کہ منزلیں اور اُن کے حالات اور اُن کے مسائل بدل جانے سے مسافر اور اس کی حقیقت بھی بدل جاتی ہے؟ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک اس کی ساخت بالکل نہیں بدلی، اس کے عناصر ترکیبی وہی ہیں جو اب سے ہزاروں برس پہلے تھے، اس کا مزاج وہی ہے، اس کی فطرت کے تقاضے وہی ہیں، اس کی صفات و خصوصیات وہی ہیں؛ اس کے رجحانات و میلانات وہی ہیں، اس کی قوتیں اور صلاحیتیں وہی ہیں، اس کی کمزوریاں اور

قابلیتیں وہی ہیں، اس کے فعل و انفعال اور تاثیر و تاثّر کے قاعدے وہی ہیں، اس پر کارفرمائی کرنے والی قوتیں وہی ہیں اور اس کا کائناتی ماحول بھی وہی ہے۔ ان میں سے کسی چیز میں بھی ابتدائے آفرینش سے آج تک ذرّہ برابر فرق نہیں آیا ہے۔ کوئی شخص یہ دعوے کرنے کی جرات نہیں کرسکتا کہ تاریخ کے دوران . . . میں حالات اور ان سے پیدا ہونے والے مسائلِ زندگی کے تغیّر سے خود انسانیت بھی بدلتی چلی آئی ہے، یا وہ بنیادی چیزیں بھی متغیّر ہوتی رہی ہیں، جو انسانیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ پھر جب حقیقت یہ ہے تو اس دعوے میں کیا وزن ہو سکتا ہے کہ انسان کے لئے جو چیز کل تریاق تھی، وہ آج زہر ہے، جو چیز کل حق تھی، وہ آج باطل ہے، جو چیز کل قدر رکھتی تھی وہ آج بے قدر ہے۔

انسان کیسے طریقِ زندگی کا حاجت مند ہے

اصل یہ ہے کہ انسانی افراد اور جماعتوں نے تاریخ کے دوران میں نفسِ انسانیت کو اور اس سے تعلق رکھنے والی بنیادی چیزوں کو سمجھنے میں غلطی کھا کر اور بعض حقیقتوں کے اعتراف میں مبالغہ اور بعض کے

ادراک میں قصور کر کے جو غلط نظامِ زندگی وقتاً فوقتاً اختیار کئے ، اور جنھیں انسانیتِ کبریٰ Humanity at large نے تجربے کے بعد غلط پا کر دوسرے ایسے ہی نظامات کے لئے جگہ خالی کرنے پر مجبور کر دیا ، ان کی سرگذشت کے مشاہدے سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا ہے کہ انسانیت کے لیے لازماً ہر دور میں ایک نظامِ زندگی درکار ہے ، جو صرف اسی دور کے حالات و مسائل سے پیدا ہو ، اور ان ہی کو حل کرنے کی کوشش کرے ، حالانکہ زیادہ صحت کے ساتھ اس سرگزشت سے اگر کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے ، تو وہ یہ ہے کہ اس قسم کے زمانی و دوری نظاماتِ زندگی یا بالفاظِ دیگر موسمی حشرات الارض کو ، بار بار آزمانے ، اور ہر ایک کی ناکامی کے بعد اس کے دوسرے جانشین کا تجربہ کرنے میں ، انسانیتِ کبریٰ کا وقت ضائع ہوتا ہے ، اس کی راہ ماری جاتی ہے ، اس کے نشو و ارتقار اور اپنے کمالِ مطلوب کی طرف اس کے سفر میں سخت رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔

وہ درحقیقت محتاج اور سخت محتاج ہے ایسے نظامِ زندگی کی جو خود اس کو اور اس سے تعلق رکھنے والی تمام حقیقتوں کو جان کر عالمگیر ، دائمی اور پائیدار اصولوں پر قائم کیا جائے ، جسے لے کر وہ حال و مستقبل کے تمام متغیر حالات سے بخیریت گذر سکے ۔ ان سے پیدا

ہونے والے مسائل کو حل کر سکے۔ زندگی کے راستے پر افتاں و خیزاں نہیں، بلکہ رواں اور دواں اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھ سکے۔۔

کیا انسان ایسا نظام خود بنا سکتا ہے؟

یہ ہے اس "دین" یا طریقِ زندگی یا نظامِ زندگی کی نوعیت، جس کا انسان حاجت مند ہے۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ اگر انسان خدا کی مدد سے بے نیاز ہو کر خود اپنے لئے اس نوعیت کا دین بنانا چاہے، تو کیا وہ اس کوشش میں کامیاب ہو سکتا ہے؟ یہ سوال میں آپ کے سامنے پیش نہ کروں گا کہ آیا انسان اب تک ایسا دین خود بنانے میں کامیاب ہوا ہے کیونکہ اس کا جواب تو قطعاً نفی میں ہے۔ خود وہ لوگ بھی جو آج بڑے بڑے بلند بانگ دعووں کے ساتھ اپنے اپنے دین پیش کر رہے ہیں، اور ان کے لئے ایک دوسرے سے لڑ مر رہے ہیں۔ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کسی کا پیش کردہ دین ان ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، جن کے لئے انسان، من حیث الانسان ایک "الدّین" کا محتاج ہے۔ کسی کا دین نسلی و قومی ہے کسی کا جغرافیائی، کسی کا طبقاتی، اور کسی کا دین پیدا ہی

اِس دَور کے تقاضوں سے ہوا ہے، جو ابھی کل ہی گذر چکا ہے، رہا وہ دَور جو کل آنے والا ہے، اس کے حالات و مسائل کے متعلق کچھ پیشگی نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں بھی وہ کام دے سکے گا یا نہیں، کیونکہ جو دَور اب گذر رہا ہے، ابھی تو اُسی کے تاریخی تقاضوں کا جائزہ باقی ہے۔ اسی لئے میں یہ سوال نہیں کر رہا ہوں کہ انسان ایسا دین بنانے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں۔ بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ کامیاب ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟

یہ ایک نہایت اہم سوال ہے۔ جس سے سرسری طور پر بحث کرنا مناسب نہیں۔ یہ انسانی زندگی کے فیصلہ کن سوالات میں سے ایک ہے۔ اس لئے پہلے خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ وہ چیز کیا ہے، جسے وضع کرنے کا سوال درپیش ہے، اس شخص کی قابلیتیں کیا ہیں، جس کے متعلق یہ پوچھا جا رہا ہے کہ وہ اس کو وضع کر سکتا ہے یا نہیں۔

الدّین کی نوعیت

انسان کے لئے جس "الدّین" کی ضرورت میں نے ابھی ثابت کی ہے اس سے مراد کوئی ایسا تفصیلی ضابطہ نہیں ہے، جس میں ہر زمانے اور ہر قسم کے حالات کے لئے تمام چھوٹے بڑے جزئیات

تک مرتّب ہوں، اور جس کی موجودگی میں انسان کا کام صرف اس کے مطابق عمل کرنا ہو۔ بلکہ دراصل اس سے مراد ایسے ہمہ گیر ازلی و ابدی اصول ہیں جو تمام حالات میں انسان کی رہنمائی کرسکیں، اس کی فکر و نظر، سعی و جہد اور پیش قدمی کے لئے صحیح رُخ متعین کرسکیں اور اُسے غلط تجربات میں وقت اور محنت اور قوت ضائع کرنے سے بچاسکیں، اس غرض کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ انسان کو اس بات کا علم —— قیاس و گمان نہیں بلکہ علم —— ہو کہ اس کی اور کائنات کی حقیقت کیا ہے، اور کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ پھر وہ اس بات کے جاننے کا —— سمجھ بیٹھنے کا نہیں بلکہ جاننے کا —— حاجت مند ہے کہ آیا زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے یا پوری زندگی کا ایک ابتدائی حصّہ ہے، آیا سفر بس پیدائش سے لے کر موت تک کی مسافت کا ہے، یا یہ پورے سفر میں سے محض ایک مرحلہ ہے۔ پھر اس کے لئے ناگزیر ہے کہ ایک ایسا مقصد زندگی اس کے لئے متعین ہو جو حقیقت کے اعتبار سے —— نہ کہ محض خواہش کی بنا پر —— واقعی حیاتِ انسانی کا مقصود ہو، جس کے لئے دراصل انسان پیدا کیا گیا ہو اور جس کے ساتھ ہر فرد، ہر مجموعۂ افراد، اور بحیثیت کلی تمام انسانیت کے مقاصد، تمام زمانوں و

ہیں، بلا کسی تصادم و مزاحمت کے ہم آہنگ ہو سکیں۔ پھر اس کو اخلاق کے ایسے پختہ اور ہمہ گیر اصولوں کی ضرورت ہے، جو اس کی فطرت کی تمام خصوصیات کے ساتھ مناسبت بھی رکھتے ہوں، اور تمام ممکن حالات پر نظری و عملی حیثیت سے منطبق ہو سکتے ہوں، تاکہ وہ ان ہی اصولوں کی بنیاد پر اپنی سیرت کی تعمیر کر سکے، ان ہی کی رہنمائی میں سفرِ زندگی کی ہر منزل اور اس کے حالات میں پیش آمدہ مسائل کو حل کر سکے، اور اس خطرے میں مبتلا نہ ہو کہ تغیر پذیر حالات و مسائل کے ساتھ ساتھ اخلاق کے اصول بناتا اور بدلتا چلا جائے۔ یعنی بالفاظِ دیگر ایک بے اصولا۔ نرا ابن الوقت Characterless Mere opportunist بن کر رہ جائے۔ پھر اس کو تمدّن کے ایسے جامع اور وسیع اصولوں کی ضرورت ہے، جو انسانی اجتماع کی حقیقت و غایت اور اس کے فطری تقاضوں کو سمجھ کر بنائے جائیں جن میں افراط و تفریط اور بے اعتدالی نہ ہو، جن میں تمام انسانوں کی مجموعی مصلحت ملحوظ رکھی گئی ہو اور جن کی پیروی کر کے ہر زمانے میں انسانی زندگی کے ہر پہلو کی تشکیل، تعمیر اور ترقی کے لئے سعی کی جا سکے۔ پھر اُسے شخصی کردار، اور اجتماعی رویّہ اور انفرادی و اجتماعی سعی و عمل کو صحیح سمت سفر کا پابند اور بے راہ روی سے محفوظ رکھنے کے لئے

ایسے جامع حدود کی ضرورت ہے، جو شاہراہِ زندگی پر نشاناتِ راہ کا کام دیں، اور ہر موڑ اور ہر دوراہے، ہر خطرناک مرحلے پر اسے آگاہ کر دیں کہ تیرا راستہ اُدھر نہیں، بلکہ اِدھر ہے۔ پھر اس کو چند ایسے عملی ضابطوں کی ضرورت ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے دائمی اور عالم گیر پیروی کے قابل ہوں اور انسانی زندگی کو اس حقیقتِ نفس الامری، اس مآلِ زندگی، اس مقصدِ حیات، ان اصولِ اخلاق، ان اصولِ تمدن اور ان حدودِ عمل سے ہمیشہ وابستہ رکھیں، جن کی تعیین اس "الدّین" میں کی گئی ہو۔

یہ ہے وہ چیز جسے وضع کرنے کا سوال درپیش ہے۔ اب غور کیجیے، کیا انسان ایسے ذرائع رکھتا ہے، جن سے وہ خود اپنے لئے ایک ایسا "الدّین" وضع کر سکے؟

انسانی ذرائع کا جائزہ

انسان کے پاس اپنا "دین" یا طریقِ زندگی اخذ کرنے کے ذرائع چار سے زیادہ نہیں ہیں۔ پہلا ذریعہ خواہش ہے؛ دوسرا ذریعہ عقل ہے، تیسرا ذریعہ مشاہدہ و تجربہ ہے، چوتھا ذریعہ پچھلے تجربات کا تاریخی ریکارڈ ہے۔ غالباً ان کے سوا کسی پانچویں ذریعے کی نشاندہی

نہیں کی جا سکتی۔ ان چاروں ذرائع کا جتنا مکمل جائزہ لے کر آپ دیکھ سکتے ہوں، دیکھئے کہ آیا یہ "الدّین" کے ایجاد کرنے میں انسان کی مدد کر سکتے ہیں؟ میں نے اپنی عمر کا معتدبہ حصّہ اس کی تحقیق میں صرف کیا ہے، اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ ذرائع "الدّین" کی ایجاد میں تو مدد نہیں دے سکتے، البتہ اگر کوئی غیر انسانی رہنما "الدّین" کو پیش کر دے، تو اسے سمجھنے، پرکھنے، پہچاننے اور اس کے مطابق زندگی کے تفصیلی نظام کو وقتاً فوقتاً مرتّب کرتے رہنے میں ضرور مددگار بن سکتے ہیں۔

خواہش پہلے خواہش کو لیجئے۔ کیا یہ انسان کی رہنما بن سکتی ہے؟ اگرچہ یہ انسان کے اندر اصلی محرّکِ عمل ہے مگر اس کی عین فطرت میں جو کمزوریاں موجود ہیں ان کی بناء پر یہ رہنمائی کے قابل ہرگز نہیں ہو سکتی۔ تنہا رہنمائی کرنا تو درکنار عقل اور علم کو بھی اکثر اس نے گمراہ کیا ہے۔ اس کو تربیت سے خواہ کتنا ہی روشن خیال بنا دیا جائے، بہرحال آخری فیصلہ جب کبھی اس پر چھوڑا جائے گا، یہ بلا مبالغہ ۹۹ فیصدی حالات میں غیر مستقیم ہی فیصلہ کرے گی، کیونکہ اس کے اندر جو تقاضے پائے جاتے ہیں، وہ اس کو صحیح فیصلہ کرنے کے بجائے ایسا فیصلہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں، جس

سے مطلوب کسی نہ کسی طرح جلدی اور بآسانی حاصل ہو جائے ۔ یہ نفس "خواہشِ انسانی" کی طبعی کمزوری ہے ۔ لہٰذا خواہ ایک فرد کی خواہش ہو، یا ایک طبقے کی ہو، یا وہ خواہشِ عام ۔ General Will جس کا روسو نے ذکر کیا ہے، بہرحال کسی قسم کی انسانی خواہش میں بھی فطرۃً یہ صلاحیت نہیں ہے کہ ایک "الدّین" کے وضع کرنے میں مددگار بن سکے بلکہ جہاں تک مسائلِ عالیہ Ultimate Problem مثلاً حیاتِ انسانی کی حقیقت، اس کے مآل اور اس کی غایت کا تعلق ہے، اس کو حل کرنے میں تو وہ کسی طرح مددگار بن ہی نہیں سکتی ۔

عقل پھر عقل کو لیجئے ۔ اس کی تمام بہترین صلاحیتیں مسلّم انسانی زندگی میں اس کی اہمیت بھی ناقابلِ انکار، اور یہ بھی تسلیم کہ انسان کے اندر یہ بہت بڑی رہنما طاقت ہے لیکن قطع نظر اس سوال کے کہ انسان کے لئے "الدّین" کس کی عقل وضع کرے گی، زید کی؟ بکر کی؟ تمام انسانوں کی؟ یا انسانوں کے کسی خاص گروہ کی؟ اس زمانے کے لوگوں کی؟ یا کسی پچھلے زمانہ والوں کی؟ یا آئندہ آنے والوں کی؟ سوال صرف یہ ہے کہ نفس "عقلِ انسانی" کے حدود کا جائزہ لینے کے بعد کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ "الدّین" کے وضع کرنے میں اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ اس کے تمام فیصلے منحصر ہیں اس

مواد پر، جو حواس اس کو فراہم کر کے دیں۔ وہ غلط مواد فراہم کر کے دیں گے، تو یہ غلط فیصلہ کر دے گی، وہ ناقص مواد فراہم کر کے دیں گے تو یہ ناقص فیصلہ کر دے گی۔ اور جن امور میں وہ کوئی مواد فراہم کر کے نہ دیں گے، ان میں اگر یہ خود شناس ہے تو کوئی فیصلہ نہ کرے گی، اور اگر بر خود غلط ہے تو اندھیرے میں چوپائی تیر چلاتی رہے گی۔ یہ محدود ہتیں جس بے چاری عقل کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، وہ آخر کس طرح اس کی اہل ہو سکتی ہے کہ نوعِ انسانی کے لئے "الدّین" بنانے کی تکلیف اسے دی جائے؟ "الدّین" بنانے کا انحصار جن مسائلِ عالیہ کے حل پر ہے، ان میں حواس سرے سے کوئی مواد فراہم ہی نہیں کرتے۔ پھر کیا ان مسائل کا فیصلہ تخیّلات، لاطائل قیاسات اور مجرد اوہام سے کیا جائیگا؟ "الدّین" بنانے کے لئے جن مستقل اخلاقی قدروں کا تعین ناگزیر ہے ان کے لئے حواس بہت ہی ناقص مواد فراہم کرتے ہیں۔ پھر کیا عقل سے اُمّید کی جا سکتی ہے کہ وہ ناقص مواد پر صحیح و کامل قدریں متعیّن کرے گی؟ اسی طرح "اَلدّین" کے جو دوسرے اجزائے ترکیبی میں نے بیان کئے ہیں، ان میں سے کسی ایک جز کے لئے بھی حواس سے بالکل صحیح اور مکمل مواد حاصل نہیں ہو سکتا، جس کی بنا پر عقل ایک جامع اور مکمل نظام بنا سکے، اور اس پر مزید یہ ہے کہ عقل کے ساتھ خواہش کا عنصر مستقل طور پر لگا ہوا

ہے جو اسے ٹھیٹھ عقلی فیصلے دینے سے روکتا ہے" اور اس کی راستروی کو کچھ نہ کچھ ٹیڑھ کی طرف مائل کر کے ہی چھوڑتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ عقلِ انسانی حواس کے فراہم کردہ مواد کی ترتیب اور اس سے استدلال کرنے میں کوئی غلطی نہ کرے گی، تب بھی اپنی کمزوریوں کی بنا پر وہ اتنا قابل ہونا نہیں رکھتی کہ اتنے بڑے کام کا بوجھ اس پر ڈالا جا سکے۔ یہ بوجھ اس پر ڈالنا اس پر بھی ظلم کرنا ہے اور خود اپنے اوپر بھی۔

سائنس اب تیسرے ذریعے کو لیجئے۔ یعنی وہ علم جو مشاہدات و تجربات سے حاصل ہوتا ہے۔ میں اس علم کی قدر و قیمت کا اعتراف کرنے میں کسی طالبِ علم سے پیچھے نہیں ہوں، نہ ذرہ برابر اس کی تحقیر کرنا پسند کرتا ہوں۔ لیکن اس کی محدودیتوں کو نظر انداز کر کے اسے وہ وسعت دینا جو فی الواقع اسے حاصل نہیں ہے، میرے نزدیک بے علمی ہے۔ "علمِ انسانی" کی حقیقت پر جس شخص کی بھی نظر ہوگی وہ اس بات کو ماننے سے انکار نہ کرے گا کہ جہاں تک مسائلِ عالیہ کا تعلق ہے، ان کی کنہ تک اس کی رسائی محال ہے، کیونکہ انسان کو وہ ذرائع حاصل ہی نہیں ہیں، جن سے وہ اس تک پہنچ سکے، نہ وہ اس کا براہِ راست مشاہدہ کر سکتا ہے اور نہ مشاہدہ و تجربہ کے تحت آنے والی اشیاء سے استدلال کر کے اس کے متعلق ایسی رائے قائم کر سکتا ہے جس پر علم

کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ لہٰذا "الدّین" وضع کرنے کے لئے جن مسائل کا حل معلوم کرنا سب سے پہلی ناگزیر ضرورت ہے، وہ تو علم کی دسترس سے باہر ہی ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اخلاقی قدریں، تمدّن کے اصول اور بے راہ روی سے بچانے والے حدود متعین کرنے کا کام، آیا علم کے حوالے کیا جا سکتا ہے یا نہیں، تو اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ یہ کام کس شخص یا کس گروہ یا کس زمانے کا علم انجام دے گا، ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ علمی طور پر یہ کام انجام دینے کے لئے ناگزیر شرائط کیا ہیں؟ اس کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ ان تمام قوانینِ فطرت کا علم حاصل ہو جن کے تحت انسان اس دنیا میں جی رہا ہے۔ اس کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ خود انسان کی اپنی زندگی سے جو علوم تعلق رکھتے ہیں، وہ مکمل ہوں، اس کے لئے تیسری شرط یہ ہے کہ ان دونوں قسم کے علوم یعنی کائناتی اور انسانیاتی علوم کی معلومات یکجا ہوں؛ اور کوئی ذہنِ کامل ان کو صحیح ترتیب دے کر ان سے صحیح استدلال کر کے انسان کے لئے اخلاقی قدروں، تمدن کے اصولوں اور بے راہ روی سے بچانے والی حدود کا تعین کرے۔ یہ شرائط نہ اس وقت تک پوری ہوئی ہیں، نہ اُمید کی جاتی ہے کہ پانچ ہزار برس بعد پوری ہو جائیں گی۔ ممکن ہے کہ انسانیت کی وفات سے ایک دن پہلے یہ پوری ہو جائیں۔ مگر اُس وقت اس کا

فائدہ ہی کیا ہو گا۔

تاریخ آخر میں اس ذریعۂ علم کو لیجئے، جسے ہم پہلے انسانی تجربات کا تاریخی ریکارڈ یا انسانیت کا نامۂ اعمال کہتے ہیں۔ اس کی اہمیت اور اس کے فائدوں سے مجھے انکار نہیں ہے۔ مگر میں کہتا ہوں اور غور کریں گے تو آپ بھی مان لیں گے کہ "الدین" وضع کرنے کا عظیم الشان کام انجام دینے کیلئے یہ بھی ناکافی ہے۔ میں یہ سوال نہیں کرتا کہ یہ ریکارڈ ماضی سے حال کے لوگوں تک صحت اور جامعیت کے ساتھ پہنچا بھی ہے یا نہیں؟ میں یہ بھی نہیں پوچھتا کہ اس ریکارڈ کی مدد سے "الدّین" وضع کرنے کے لئے انسانیت کا نمائندہ کس ذہن کو بنایا جائے گا؟ ہیگل کے ذہن کو؟ مارکس کے ذہن کو؟ ارنسٹ ہیکل کے ذہن کو؟ یا کسی اور ذہن کو؟ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ماضی حال یا مستقبل میں کس تاریخ تک کا ریکارڈ ایک "الدّین" وضع کرنے کے لئے کافی مواد فراہم کر سکے گا؟ اس تاریخ کے بعد پیدا ہونے والے خوش قسمت ہیں، باقی رہے اس سے پہلے گذر جانے والے، تو ان کا بس اللہ ہی حافظ ہے۔

مایوس کُن نتیجہ

یہ مختصر اشارات جو میں نے کئے ہیں، مجھے توقع ہے کہ میں نے ان میں کوئی علمی استدلالی غلطی نہیں کی ہے، اور اگر انسان کے ذرائع کا جائزہ، جو میں نے لیا ہے، صحیح ہے تو پھر ہمیں کوئی چیز اس یقین تک پہنچنے سے باز نہیں رکھ سکتی کہ انسان اپنے لئے کوئی کچا پکا غلط سلط وقتی اور مقامی "دین" تو وضع کر سکتا ہے، لیکن وہ چاہے کہ "الدّین" وضع کر سکے، تو یہ قطعی محال ہے۔ پہلے بھی محال تھا، آج بھی محال ہے، اور آئندہ کے لئے بھی اس کے امکان سے پوری مایوسی ہے۔

اب اگر کوئی خدا رہنمائی کے لئے موجود نہیں، جیسا کہ منکرینِ خدا کا خیال ہے، تو انسان کے لئے مناسب یہ ہے کہ خودکشی کر لے۔ جس مسافر کے لئے نہ کوئی رہنما موجود ہو اور نہ جس کے اپنے پاس راستہ معلوم کرنے کے ذرائع موجود ہوں اس کے لئے یاس اور کامل یاس کے سوا کچھ مقدر نہیں، اس کا کوئی ہمدرد اس کے سوا اسے اور کیا مشورہ دے سکتا ہے کہ سرِ راہ ایک پتھر سے اپنی مشکل آسان کر لے اور اگر خدا

ہے، لیکن رہنمائی کرنے والا خدا نہیں ہے جیسا کہ بعض فلسفیانہ اور سائنٹفک طرز کے مثبتینِ خدا کا گمان ہے تو یہ اور بھی زیادہ افسوسناک صورت حال ہے۔ جس خدا نے موجوداتِ عالم کے بقاو نشوونما کے لئے ہر اس چیز کی فراہمی کا انتظام کیا ہے جس کی ضرورت کا تصور کیا جاسکتا ہو، لیکن نہیں ایک کیا تو صرف انسان کی سب سے بڑی ضرورت کا انتظام، جس کے بغیر نوع کی زندگی غلط ہوئی جاتی ہے۔ اس کی بنائی ہوئی دنیا میں رہنا ایک مصیبت ہے۔ ایسی سخت مصیبت جس سے بڑھ کر کسی دوسری مصیبت کا تصور ممکن نہیں۔ آپ غریبوں اور مفلسوں، بیماروں اور زخمیوں، مظلوموں اور دکھی جنتاؤں کی مصیبت پر کیا روتے ہیں۔ رویئے اس پوری نوع کی مصیبت پر جو اس بے چارگی کے عالم میں چھوڑ دی گئی ہے کہ بار بار غلط تجربے کر کے ناکام ہوتی ہے۔ ٹھوکریں کھا کر گرتی ہے اور پھر اُٹھ کر چلتی ہے تاکہ پھر ٹھوکر کھائے۔ ہر ٹھوکر پر ملک کے ملک اور قومیں کی قومیں تباہ ہو جاتی ہیں، اس غریب کو اپنے مقصدِ زندگی تک کی خبر نہیں ہے، کچھ نہیں جانتی کہ کاہے کے لئے سعی و عمل کرے اور کس ڈھنگ پر کرے۔ یہ سب کچھ وہ خدا دیکھ رہا ہے، جو اسے زمین پر وجود میں لایا ہے، مگر وہ بس پیدا کرنے سے مطلب رکھتا ہے۔ رہنمائی کی پروا نہیں کرتا۔

اُمید کی ایک ہی کرن

اس تصویر کے بالکل برعکس قرآن ہمارے سامنے صورتِ حال کا ایک دوسرا نقشہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا محض پیدا ہی کر دینے والا نہیں ہے، بلکہ رہنمائی کرنے والا بھی ہے۔ اس نے موجوداتِ عالم میں ہر چیز کو وہ ہدایت بخشی ہے، جو اس کی فطرت کے لحاظ سے اس کے لئے ضروری ہے۔ (اَلَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی) اگر اس کا ثبوت چاہو تو جس چیونٹی، جس مکھی، جس مکڑی کو چاہو پکڑ کر دیکھ لو۔ وہی خدا انسان کی بھی رہنمائی کرنے والا ہے لہٰذا انسان کے لئے صحیح طریقۂ کار یہ ہے کہ خودسری چھوڑ کر اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے۔ اور جس جامع و مکمل نظامِ زندگی یا "الدین" کی ہدایت اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے بھیجی ہے، اس کی پیروی اختیار کر لے۔

دیکھئے ایک طرف تو وہ نتیجہ ہے جو انسان کی قوتوں اور اس کے ذرائع کا جائزہ لینے سے ہم کو حاصل ہوتا ہے، اور دوسری طرف قرآن کا یہ دعویٰ ہے۔ ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ یا تو اس دعویٰ کو قبول کریں یا پھر اپنے آپ کو مایوسی اور اس مایوسی کے حوالے کر دیں جس کے اندھیرے میں کہیں برائے نام بھی امید کی کوئی کرن نظر

نہیں آتی۔ دراصل صورتِ حال یہ ہے ہی نہیں کہ "الدین" حاصل ہونے کے دو وسیلے موجود ہوں، اور سوال یہ ہو کہ ہم ان میں سے کس وسیلے سے مدد لیں۔ اصلی صورتِ حال یہ ہے کہ "الدین" جس وسیلے سے ہم کو مل سکتا ہے، وہ صرف ایک ہے اور انتخاب کا سوال صرف اس امر میں ہے کہ آیا ہم اس تنہا وسیلے سے مدد لیں، یا اس کی دستگیری کا فائدہ اٹھانے کے بجائے تاریکی میں بھٹکتے پھرنے کو ترجیح دیں۔

قرآن کے دلائل

یہاں تک جو استدلال میں نے کیا ہے، وہ تو ہم کو محض اس حد تک پہنچاتا ہے کہ ہماری فلاح کے لئے قرآن کے اس دعوے کو قبول کئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر کا قرشتوانی شد ناچار مسلمان شو۔ لیکن قرآن اپنے دعوے کی تائید میں جو دلائل پیش کرتا ہے وہ اس سے بہت زیادہ اعلیٰ و اشرف ہیں۔ کیونکہ وہ ہمیں بادلِ ناخواستہ مسلمان ہونے کے بجائے برضا و رغبت مسلمان ہونے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس کی بہت سی دلیلوں میں چار سب سے زیادہ پُرزور ہیں اور ان ہی کو اس نے بار بار بہ تکرار پیش کیا ہے۔

(۱) انسان کے لئے اسلام ہی ایک صحیح طریقِ زندگی ہے اس لئے کہ یہی

حقیقتِ نفس الامری کے مطابق ہے، اور اس کے سوا ہر دوسرا رویہ خلافِ حقیقت ہے۔

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ۔ (آل عمران ۹)

کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں حالانکہ وہ سب چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور وہ جو زمین میں ہیں چار و ناچار اسی کے آگے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں اور اسی کی طرف انہیں پلٹ کر جانا ہے۔

(۲) انسان کے لئے یہی ایک صحیح طریقِ زندگی ہے، کیونکہ یہی حق ہے اور از روئے انصاف اس کے سوا کوئی دوسرا رویہ صحیح نہیں ہو سکتا۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ۔ (الاعراف)

حقیقت میں تمہارا رب (مالک، فرماں روا) اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دوروں میں پیدا کیا اور پھر اپنے تختِ سلطنت پر جلوہ گر ہوا۔ جو دن کو رات کا لباس اڑھاتا ہے اور پھر رات کے تعاقب میں دن تیزی کے ساتھ دوڑا آتا ہے، سورج اور چاند اور تارے سب کے سب جس کے تابع فرمان ہیں سنو! خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا۔ بڑا برکت کرنے والا ہے وہ کائنات کا رب۔

(۳) انسان کے لئے یہی رویّہ صحیح ہے ۔ کیونکہ تمام حقیقتوں کا صحیح علم صرف خدا کو ہے اور بے خطا ہدایت صرف وہی کر سکتا ہے ۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ

درحقیقت اللہ سے نہ زمین کی کوئی چیز چھپی ہوئی ہے اور نہ آسمانوں کی

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ

جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے وہ بھی اسکے علم میں ہے اور لوگ اس کی معلومات میں سے کسی چیز پر بھی حاوی نہیں ہو سکتے بجز ان چیزوں کے جن کا علم وہ خود ان کو دینا چاہے ۔

قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ ۔

اے پیغمبر کہدو کہ اصلی ہدایت صرف خدا ہی کی ہدایت ہے ۔

(۴) انسان کے لئے یہی ایک راہِ راست ہے کیونکہ اس کے بغیر عدل ممکن نہیں ۔ اس کے سوا جس راہ پر بھی انسان چلے گا وہ بالآخر ظلم ہی کی طرف جائے گی ۔

وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۔

جو اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کرتے ہیں وہی ظالم ہیں ۔

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۔

جو اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی ظالم ہیں ۔

یہ دلائل ہیں جن کی بنا پر ایک معقول انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے اور ہدایت کے لئے اس کی طرف رجوع کرے۔

خدائی ہدایت کے پرکھنے کا معیار

اب آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک سوال کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں جو لازماً اس مرحلے پر پہنچ کر ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اپنی تحقیق کے دوران میں خود میرے دل میں بھی پیدا ہو چکا ہے، وہ سوال یہ ہے کہ کیا ہم ہر اُس شخص کی بات مان لیں جو ایک دن ہمارے سامنے اس دعوے کے ساتھ پیش کر دے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے، تو آخر ہمارے پاس وہ کیا معیار ہے، جس سے ہم انسانی ساخت کے دین اور خدائی ہدایت کے دین میں فرق کر سکیں؟ اس کا جواب اگرچہ بڑی مفصل تحقیقی بحث چاہتا ہے، مگر میں یہاں مختصر اشاروں میں وہ چار بڑے معیار بیان کروں گا، جو انسانی فکر اور خدائی فکر کو ممیز کرتے ہیں۔

انسانی فکر کی پہلی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علم کی غلطی اور محدودیت کا اثر لازماً پایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس خدائی فکر میں غیر محدود علم اور صحیح علم کی شان بالکل نمایاں ہوتی ہے، جو چیز خدا کی طرف سے ہو گی

اس میں آپ ایسی کوئی چیز نہیں پا سکتے جو کبھی کسی زمانے میں کسی ثابت شدہ علمی حقیقت کے خلاف ہو، یا جس کے متعلق یہ ثابت کیا جا سکے کہ اس کے مصنف کی نظر سے حقیقت کا فلاں پہلو اوجھل رہ گیا۔ مگر اس معیارِ تحقیق استعمال کرتے ہوئے یہ بات نہ بھول جانی چاہیئے کہ علم اور علمی قیاس اور نظریۂ علمی میں بڑا فرق ہے۔ ایک وقت میں جو علمی قیاسات اور علمی نظریات دماغوں پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں، اکثر غلطی سے ان کو "علم" سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان کے غلط ہونے کا اتنا ہی امکان ہوتا ہے جتنا ان کے صحیح ہونے کا۔ اور تاریخ علم میں ایسے بہت کم قیاسات و نظریات کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جو بالآخر "علم" ثابت ہوئے ہیں۔

انسانی فکر کی دوسری بڑی کمزوری نقطۂ نظر کی تنگی ہے۔ اس کے برخلاف خدائی فکر میں وسیع ترین نقطۂ نظر پایا جاتا ہے۔ جب آپ خدائی فکر سے نکلی ہوئی کسی چیز کو دیکھیں گے تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا جیسے اس کا مصنف ازل سے ابد تک دیکھ رہا ہے۔ پوری کائنات کو دیکھ رہا ہے۔ تمام حقیقتوں کو بیک نگاہ دیکھ رہا ہے۔ اسکے مقابلے میں بڑے سے بڑے فلسفی اور مفکّر کی فکر بھی ایک بچّے کی فکر محسوس ہوگی۔

انسانی فکر کا تیسرا اہم خاصہ یہ ہے کہ اس میں حکمت و دانش، جذبات

وخواہشات کے ساتھ کہیں نہ کہیں ساز باز اور مصالحت کرتی نظر آہی جاتی ہے۔ بہ خلاف اس کے خدائی فکر میں بے لاگ حکمت اور خالص دانشمندی کی شان اتنی نمایاں ہوتی ہے کہ اس کے احکام میں کہیں آپ جذباتی جھکاؤ کی نشاندہی نہیں کر سکتے۔

انسانی فکر کی ایک اور کمزوری یہ ہے کہ نظامِ زندگی وہ خود تصنیف کرے گا۔ اس میں جانب داری، انسان اور انسان کے درمیان غیر عقلی امتیاز، اور غیر عقلی بنیادوں ہی پر ترجیح بعض علی بعض کا عنصر لازماً پایا جائے گا، کیونکہ ہر انسان کی کچھ ذاتی دلچسپیاں ہوتی ہیں، جو بعض انسانوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں اور بعض کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتیں۔ برخلاف اس کے خدائی فکر سے نکلا ہوا نظامِ زندگی ایسے ہر عنصر سے بالکل پاک ہوگا۔ اس معیار پر آپ ہر اس نظامِ زندگی کو جانچ کر دیکھیے جو اپنے آپ کو خدا کی طرف سے "الدّین" کہتا ہو۔ اگر وہ انسانی فکر کی ان تمام خصوصیات سے خالی ہو اور پھر جامعیت اور ہمہ گیری کی شان بھی رکھتا ہو جو اس سے پہلے میں نے "الدّین" کی ضرورت ثابت کرتے ہوئے بیان کی ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس پر ایمان لانے میں تامل کریں۔

ایمان کے تقاضے

اب مجھے اپنے خطبے کے بنیادی سوالات میں آخری سوال پر کچھ گفتگو کرنی ہے، اور وہ یہ ہے کہ آدمی جب قرآن کے اس دعوے کو تسلیم کرلے اور اس "الدّین" پر ایمان لے آئے، جس کے منجانب اللہ ہونے کا اطمینان اسے حاصل ہو گیا، تو اس تسلیم کرنے اور ایمان لانے کے مقتضیات کیا ہیں۔

میں ابتدا میں عرض کرچکا ہوں کہ اسلام کے معنی جھک جانے سپر ڈال دینے، اپنے آپ کو سپرد کر دینے کے ہیں۔ اس جھکاؤ، سپردگی اور سپر اندازی کے ساتھ خود رائی، خود مختاری اور فکر و عمل کی آزادی ہرگز نہیں نبھ سکتی۔ جس دین پر بھی آپ ایمان لائیں، آپ کو اپنی پوری شخصیت اس کے حوالے کردینی ہوگی، اپنی کسی چیز کو بھی آپ اس کی پیروی سے مستثنیٰ نہیں کرسکتے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ آپ کے دل اور دماغ کا دین ہو، آپ کی آنکھ اور کان کا دین ہو، آپ کے ہاتھ اور پاؤں کا دین ہو، آپ کے پیٹ اور دھڑ کا دین ہو، آپ کے قلم اور زبان کا دین ہو، آپ کے اوقات اور آپ کی محنتوں کا دین ہو، آپ کی سعی اور عمل کا دین ہو، آپ کی محبت اور نفرت کا دین ہو، آپ کی دوستی اور دشمنی کا دین ہو، غرض

آپ کی شخصیت کا کوئی جزء اور کوئی پہلو بھی اس دین سے خارج نہ ہو۔ جس چیز کو بھی جتنا اور جس حیثیت سے آپ اس دین کے احاطے سے باہر اور اس کی پیروی سے مستثنیٰ رکھیں گے، سمجھ لیجئے کہ اسی قدر آپ کے دعوائے ایمان میں جھوٹ شامل ہے۔ اور ہر راستی پسند انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی کو جھوٹ سے پاک رکھنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔

پھر یہ بھی میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں کہ انسانی زندگی ایک کُل ہے جسے شعبوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا انسان کی پوری زندگی کا ایک ہی دین ہونا چاہیئے۔ دو دو اور تین تین دینوں کی بیک وقت پیروی بجز اس کے کچھ نہیں کہ ایمان کے ڈانواں ڈول اور عقلی فیصلے کے مضطرب ہونے کا ثبوت ہے۔ جب فی الواقع کسی دین کے "الدین" ہونے کا اطمینان آپ حاصل کر لیں اور اس پر ایمان لے آئیں، تو لازماً اس کو آپ کی زندگی کے تمام شعبوں کا دین ہونا چاہیئے۔ اگر وہ شخصی حیثیت سے آپ کا دین ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ وہی آپ کے گھر کا دین بھی نہ ہو، آپ کی تربیتِ اولاد کا، آپ کی تعلیم اور آپ کے مدرسہ کا، آپ کے کاروبار اور کسبِ معاش کا، آپ کی مجلسی زندگی اور قومی طرزِ عمل کا، آپ کے تمدن اور سیاست کا، آپ کے ادب اور آرٹ کا دین بھی نہ ہو۔ جس طرح یہ بات محال ہے کہ ایک ایک موتی اپنی جگہ تو موتی ہو، مگر جب تسبیح کے

رشتے میں بہت سے موتی منظم ہوں، تو سب مل کر دانہ نخود بن جائیں۔ اسی طرح یہ بات بھی میرے دماغ کو اپیل نہیں کرتی کہ انفرادی حیثیت سے تو ہم ایک دین کے پیرو ہوں، مگر جب اپنی زندگی کو منظم کریں، تو اس منظم زندگی کا کوئی پہلو اس دین کی پیروی سے مستثنیٰ رہ جائے۔

ان سب سے بڑھ کر ایمان کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ جس دین کے "الدّین" ہونے پر آپ ایمان لے آئیں، اس کی برکتوں سے ابنائے نوع کو بہرہ ور کرنے کی کوشش کریں، اور آپ کی تمام سعی و جہد کا مرکز و محور یہ ہو کہ یہی "الدّین" تمام دنیا کا دین بن جائے۔ جس طرح حق کی فطرت یہ ہے کہ وہ غالب ہو کر رہنا چاہتا ہے، اسی طرح حق پرستی کی بھی یہ عین فطرت ہے کہ وہ حق کو جان لینے کے بعد باطل پر اُسے غالب کرنے کی سعی کیے بغیر چین نہیں لے سکتی۔ جو شخص دیکھ رہا ہو کہ باطل ہر طرف زمین اور اس کے باشندوں پر چھایا ہوا ہے، اور پھر یہ منظر، اس کے اندر کوئی بے کلی، کوئی چبھن، کوئی تڑپ، پیدا نہیں کرتا، اس کے دل میں اگر حق پرستی ہے بھی تو سوئی ہوئی ہے۔ اسے فکر کرنی چاہیئے کہ یہ نیند کا سکوت کہیں موت کے سکوت میں تبدیل نہ ہو جائے۔

دعوتِ اسلامی کو سمجھئے

اسلام کی ابتدا	۲۵ پیسے
دعوتِ اسلامی	۱/۵۰ روپیہ
جماعتِ اسلامی کی دعوت	۶۰ پیسے
تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں	۷۵ "
دعوت اسلامی کیا ہے؟	۷۰ "
جماعتِ اسلامی ہند ایک تعارف	۱/- روپیہ
تحریک اسلامی ہند	۴/۵۰ روپیہ
روداد جماعت اسلامی اوّل	۱/۳۰ روپیہ
" " دوم	۱/ روپیہ
" " سوم	۳/ روپیہ
" " چہارم	۲/ روپیہ
" " پنجم	۴/ روپیہ
روداد مجلس شوریٰ	۳/۲۵ روپیہ
تحریکِ اسلامی دوسری اجتماعی تحریکوں کے مقابل میں	۱/۳ روپیہ
امتِ مسلمہ کا نصب العین	۲/۰ روپیہ
تحریکِ اسلامی میں کارکنوں کے باہمی تعلقات	۲/۰ روپیہ

فہرست کتب مفت منگائیے

ہماری مطبوعات

اسلام آپ سے کیا چاہتا ہے	(سید حامد علی)	۲/۰
خطبۂ مسنونہ	(〃)	-/۳۶
فقہ اسلامی اوّل	(محمد یوسف اصلاحی)	۵/-
اسلام کا روشن مستقبل	(سید قطب رح)	۲/۵۰
تحریکِ اسلامی اور کامیابی کے شرائط	(سید ابوالاعلیٰ)	۱/-
خطباتِ حرم	(〃)	-/۹۰
اسلام کا سرچشمۂ قوت	(〃)	۲/-
جنسی تعلقات اور قوانین فطرت	(〃)	۱/-
اَولیاء اللہ	(عروج قادری)	-/۷۵
آپ کی اُلجھنیں	(محمد عمر افضل)	۲/-
خدمتِ خلق	(ملک حبیب اللہ)	-/۳۶
مالک پکارتا ہے	(〃)	۱/۶۰
انسانی اخوّت	(〃)	-/۵۰
دُرِّ یتیم	(ماہر القادری)	۴/۵۰
کاروانِ حجاز	(〃)	۶/۲۵
فنِ تعلیم و تربیت	(افضل حسین)	۹/-

اُردو، ہندی، انگریزی فہرست مفت طلب فرمائیں۔

مرکزی مکتبہ اسلامی - دہلی ۶

صرف ٹائیٹل دہلی آرٹ پریس دہلی میں چھپا

نشانِ راہ

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

مطبوعاتِ اشاعتِ اسلام ٹرسٹ —— ۱۶

نشانِ راہ

از
سید ابوالاعلیٰ مودودی

مضامین

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

اگست ۱۹۷۷ء ۳۰۰۰

قیمت ۷۵ پیسے

مطبوعہ جمال پرنٹنگ پریس دہلی

پتہ :- مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہماری ذہنی غلامی اور اس کے اسباب

حکومت و فرمانروائی اور غلبہ و استیلاء کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذہنی اور اخلاقی غلبہ، دوسرا سیاسی اور مادی غلبہ۔ پہلی قسم کا غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی فطری قوتوں میں اتنی ترقی کر جائے کہ دوسری قومیں اسی کے افکار پر ایمان لے آئیں۔ اسی کے تخیلات، اسی کے معتقدات، اسی کے نظریات دماغوں پر چھا جائیں۔ ذہنیتیں اسی سانچے میں ڈھلیں۔ تہذیب اسی کی تہذیب ہو، علم اسی کا علم ہو۔ اسی کی تحقیق کو تحقیق سمجھا جائے۔ اور ہر وہ چیز باطل ٹھہرائی جائے جس کو وہ باطل ٹھہرائے۔ دوسری قسم کا غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی مادی طاقتوں کے اعتبار سے اتنی قوی بازو ہو جائے کہ دوسری قومیں اس کے مقابلے میں اپنی سیاسی آزادی کو برقرار نہ رکھ سکیں اور کلی طور پر یا کسی نہ کسی حد تک وہ غیر قوموں کے وسائلِ ثروت پر قابض اور ان کے نظمِ مملکت پر حاوی ہو جائے۔ اس کے مقابلے میں مغلوبیت اور محکومیت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذہنی مغلوبیت، دوسری سیاسی مغلوبیت۔ ان دونوں قسموں کی صفات کو ان صفات کا عکس سمجھ لیجیے جو اوپر غلبہ کی دونوں قسموں کے متعلق بیان کی گئی ہیں۔

یہ دونوں قسمیں ایک اعتبار سے الگ الگ ہیں۔ لازم نہیں ہے کہ جہاں ذہنی غلبہ ہو وہاں سیاسی غلبہ بھی ہو۔ اور نہ یہ لازم ہے کہ جہاں سیاسی غلبہ ہو وہاں

ذہنی غلبہ بھی ہو۔ لیکن فطری قانون یہ ہے کہ جو قوم عقل و فکر سے کام لیتی اور تحقیق و اکتشافات کی راہ میں پیش قدمی کرتی ہے، اس کو ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ مادّی ترقی بھی نصیب ہوتی ہے۔ اور جو قوم تفکّر و تدبر کے میدان میں مسابقت کرنا چھوڑ دیتی ہے وہ ذہنی انحطاط کے ساتھ مادّی تنزل میں بھی مبتلا ہو جاتی ہے۔ پھر چونکہ غلبہ نتیجہ ہے قوت کا، اور مغلوبیت نتیجہ ہے کمزوری کا۔ اس لیے ذہنی و مادّی حیثیت سے درماندہ اور ضعیف قومیں اپنی درماندگی اور ضعف میں جس قدر ترقی کرتی جاتی ہیں اسی قدر وہ غلامی اور محکومیت کے لیے مستعد ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور .... ذہنی اور مادّی دونوں حیثیتوں سے طاقتور قومیں ان کے دماغ اور ان کے جسم دونوں پر حکمراں ہو جاتی ہیں۔

مسلمان آج کل دُہری غلامی میں مبتلا ہیں۔ کہیں دونوں قسموں کی غلامیاں پوری طرح مسلّط ہیں۔ اور کہیں سیاسی غلامی کم اور ذہنی غلامی زیادہ ہے۔ بدقسمتی سے اس وقت کوئی اسلامی آبادی ایسی نہیں ہے جو صحیح معنوں میں سیاسی اور ذہنی اعتبار سے پوری طرح آزاد ہو۔ جہاں ان کو سیاسی استقلال اور خود اختیاری حاصل بھی ہے۔ وہاں وہ ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہیں۔ ان کے مدرسے ان کے دفتر، ان کے بازار، ان کی سوسائٹی، ان کے گھر، حتّیٰ کہ ان کے جسم تک اپنی زبانِ حال سے شہادت دے رہے ہیں کہ ان پر مغرب کی تہذیب، مغرب کے افکار، مغرب کے علوم و فنون حکمراں ہیں۔ وہ مغرب کے دماغ سے سوچتے ہیں، مغرب کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، مغرب کی بنائی ہوئی راہوں پر چلتے ہیں، خواہ ان کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔ بہر صورت یہ مفروضہ ان کے دماغوں پر مسلّط ہے کہ حق وہ ہے جس کو مغرب حق سمجھتا ہے، اور باطل وہ ہے جس کو مغرب نے باطل قرار دیا ہے۔ حق،

صداقت، تہذیب، اخلاق، انسانیت، شائستگی ہر ایک کا معیار ان کے نزدیک وہی ہے جو مغرب نے مقرر کر رکھا ہے۔ اپنے دین و ایمان، اپنے افکار و تخیلات، اپنی تہذیب و شائستگی اپنے اخلاق و آداب، سب کو وہ اسی معیار پر جانچتے ہیں جو چیز اس معیار پر پوری اُترتی ہے اسے درست سمجھتے ہیں، مطمئن ہوتے ہیں، فخر کرتے ہیں کہ ہماری فلاں چیز مغرب کے معیار پر پوری اُتر آئی۔ اور جو چیز اس معیار پر پوری نہیں اُترتی اسے شعوری یا غیر شعوری طور پر غلط مان لیتے ہیں۔ کوئی علانیہ اس کو ٹھکرا دیتا ہے کوئی دل میں گھٹتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر اسے مغربی معیار کے مطابق کر دے۔

جب ہماری آزاد قوموں کا یہ حال ہے، تو جو مسلمان قومیں مغربی اقوام کی محکوم ہیں ان کی ذہنی غلامی کا کیا پوچھنا۔

اس غلامی کا سبب کیا ہے؟ اس کی تشریح کے لیے ایک کتاب کی وسعت درکار ہے، مگر مختصراً اس کو چند لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

ذہنی غلبہ و استیلاء کی بنا دراصل فکری اجتہاد اور علمی تحقیق پر قائم ہوتی ہے۔ جو قوم اس راہ میں پیش قدمی کرتی ہے وہی دنیا کی رہنما اور قوموں کی امام بن جاتی ہے۔ اور اسی کے افکار دنیا پر چھا جاتے ہیں۔ اور جو قوم اس راہ میں پیچھے رہ جاتی ہے، اسے مقلد و متبع بننا پڑتا ہے۔ اس کے افکار و معتقدات میں یہ قوت باقی نہیں رہتی کہ وہ دماغوں پر اپنا تسلط قائم رکھ سکیں۔ مجتہد و محقق قوم کے افکار و معتقدات کا سیلاب ان کو بہا لے جاتا ہے۔ اور ان میں اتنا بل بوتا بھی نہیں رہتا کہ اپنی جگہ پر ٹھیرے رہ جائیں۔ مسلمان جب تحقیق و اجتہاد کے میدان میں آگے بڑھتے رہے،

تمام دنیا کی قومیں ان کی پیرو اور مقلد ہیں۔ اسلامی فکر ساری نوعِ انسانی کے افکار پر غالب رہی۔ حسن اور قبح، نیکی اور بدی، غلط اور صحیح کا جو معیار اسلام نے مقرر کیا وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر تمام دنیا کے نزدیک معیار قرار پایا۔ اور قصداً یا اضطراراً دنیا اپنے افکار و اعمال کو اسی معیار کے مطابق ڈھالتی رہی۔ مگر جب مسلمانوں میں اربابِ فکر اور اصحابِ تحقیق پیدا ہونے بند ہو گئے، جب انھوں نے سوچنا اور دریافت کرنا چھوڑ دیا جب وہ اکتسابِ علم اور اجتہادِ فکر کی راہ میں تھک کر بیٹھ گئے تو گویا انھوں نے خود دنیا کی رہنمائی سے استعفا دے دیا۔ دوسری طرف مغربی قومیں اس راہ میں آگے بڑھیں۔ انھوں نے غور و فکر کی قوتوں سے کام لینا شروع کیا۔ کائنات کے راز ٹٹولنے اور فطرت کی چھپی ہوئی طاقتوں کے خزانے تلاش کیے۔ اس کا لازمی نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ مغربی قومیں دنیا کی رہنما بن گئیں۔ اور مسلمانوں کو اسی طرح اُن کے اقتدار کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا، جس طرح کبھی دنیا نے خود مسلمانوں کے اقتدار کے آگے خم کیا تھا۔

چار پانچ سو سال تک مسلمان اپنے بزرگوں کے بچھائے ہوئے بستر پر آرام سے سوتے رہے، اور مغربی قومیں اپنے کام میں مشغول رہیں۔ اس کے بعد دفعتاً مغربی اقتدار کا سیلاب اُٹھا اور ایک صدی کے اندر اندر تمام روئے زمین پر چھا گیا۔ نیند کے متوالے آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھے تو دیکھا کہ مسیحی یورپ قلم اور تلوار دونوں سے مسلح ہے اور دونوں طاقتوں سے دنیا پر حکومت کر رہا ہے۔ ایک چھوٹی سی جماعت نے مدافعت کی کوشش کی۔ مگر نہ قلم کا زور تھا، نہ تلوار کا، شکست پر شکست کھاتی چلی گئی۔ رہا قوم کا سوادِ اعظم تو اس نے اسی سنت پر عمل کیا جو ہمیشہ سے کمزوروں

کی سنت رہی ہے۔ تلوار کے زور، استدلال کی قوت، عملی شواہد کی تائید اور نظر فریب حسن و جمال کے ساتھ جو خیالات، نظریات اور اصول مغرب سے آئے، آرام طلب دماغوں اور مرعوب ذہنیتوں نے ان کو ایمان کا درجہ دے دیا۔ پرانے مذہبی معتقدات اخلاقی اصول اور تمدنی آئین جو محض روائتی بنیادوں پر قائم رہ گئے تھے۔ اس نئے طاقت ور سیلاب کی رو میں بہتے چلے گئے، اور ایک غیر محسوس طریقے سے دلوں میں یہ مفروضہ جاگزیں ہو گیا کہ جو کچھ مغرب سے آتا ہے وہی حق ہے اور وہی صحت و درستی کا معیار ہے۔

مغربی تہذیب کے ساتھ جن قوموں کا تصادم ہوا ان میں سے بعض تو وہ تھیں جن کی کوئی مستقل تہذیب نہ تھی۔ بعض وہ تھیں جن کے پاس اپنی ایک تہذیب تو تھی مگر ایسی مضبوط نہ تھی کہ کسی دوسری تہذیب کے مقابلے میں وہ اپنے خصائص کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتیں۔ بعض وہ تھیں جن کی تہذیب اپنے اصول میں اس آنے والی تہذیب سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہ تھی۔ ایسی تمام قومیں تو بہت آسانی سے مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگ گئیں اور کسی شدید تصادم کی نوبت نہ آنے پائی۔ لیکن مسلمانوں کا معاملہ ان سب سے مختلف ہے۔ یہ ایک مستقل اور مکمل تہذیب کے مالک ہیں۔ ان کی تہذیب اپنا ایک مکمل ضابطہ رکھتی ہے جو فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ اور بدقسمتی سے مغربی تہذیب کے اساسی اصول کلیتہً اس تہذیب کے مخالف واقع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدم قدم پر یہ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں۔ اور ان کے تصادم سے مسلمانوں کی اعتقادی اور عملی زندگی کے ہر شعبے پر نہایت تباہ کن اثر پڑ رہا ہے۔

مغربی تہذیب نے جس فلسفہ اور سائنس کی آغوش میں پرورش پائی ہے وہ پانچ چھ سو سال سے دہریت، الحاد، لامذہبی اور مادہ پرستی کی طرف جارہے ہیں وہ جس تاریخ سو پیدا ہوئی اسی تاریخ سے مذہب کے ساتھ اس کی لڑائی شروع ہوگئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مذہب کے خلاف عقل و حکمت کی لڑائی ہی نے اس تہذیب کو پیدا کیا۔ اگرچہ کائنات کے آثار کا مشاہدہ، ان کے اسرار کی تحقیق ان کے کلّی قوانین کی دریافت ان کے مظاہر پر غور و فکر اور ان کو ترتیب دے کر قیاس و برہان کے ذریعے نتائج کا استنباط، کوئی چیز بھی مذہب کی ضد نہیں ہے۔ مگر سوئے اتفاق سے نشاۃِ جدیدہ (RENAISSANCE) کے عہد میں جب یورپ کی نئی علمی تحریک رونما ہوئی تو اس تحریک کا مقابلہ ان عیسائی پادریوں سے ہوا جنھوں نے اپنے مذہبی معتقدات کو قدیم یونانی فلسفہ و حکمت کی بنیادوں پر قائم کر رکھا تھا۔ اور جو یہ سمجھتے تھے کہ اگر جدید علمی تحقیقات اور فکری اجتہاد سے ان بنیادوں میں ذرا سا بھی تزلزل واقع ہوا تو اصل مذہب کی عمارت پیوندِ خاک ہوجائے گی۔ اس غلط تخیل کے زیرِ اثر انھوں نے نئی علمی تحریک کی مخالفت کی اور اس کے روکنے کے لیے قوت سے کام لیا۔ مذہبی عدالتیں (INQUISITIONS) قائم کی گئیں جن میں اس تحریک کے علمبرداروں کو سخت وحشیانہ اور ہولناک سزائیں دی گئیں۔ لیکن یہ تحریک ایک حقیقی بیداری کا نتیجہ تھی اس لیے تشدد سے دبنے کے بجائے اور بڑھتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ حریتِ فکر کے سیلاب نے مذہبی اقتدار کا خاتمہ کردیا۔

ابتداء میں لڑائی حریتِ فکر کے علمبرداروں اور مذہبی پیشواؤں کے درمیان تھی مگر چونکہ مذہبی پیشوا مذہب کے نام پر آزاد خیالوں سے جنگ کر رہے تھے، اس لیے

بہت جلدی اس لڑائی نے مسیحیت اور آزاد خیالی کے درمیان جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے بعد نفس مذہب (خواہ وہ کوئی مذہب ہو) اس تحریک کا مدِّ مقابل قرار پا گیا۔ سائنٹفک طریقے پر سوچنے کے معنیٰ یہ قرار پائے کہ یہ طریقِ فکر مذہبی طریقِ فکر کی عین ضد ہے۔ جو شخص سائنٹفک طریق سے کائنات کے مسائل پر غور کرے اس پر لازم ہے کہ مذہبی نظریئے سے ہٹ کر اپنی راہ نکالے۔ کائنات کے مذہبی نظریئے کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ عالم طبیعت (PHYSICAL WORLD) کے آثار اور جملہ مظاہر کی علّت کسی ایسی طاقت کو قرار دیا جائے جو اس عالم سے بالاتر ہو۔ یہ نظریہ چونکہ جدید علمی تحریک کے دشمنوں کا نظریہ تھا۔ اس لیے جدید تحریک کے علمبرداروں نے لازم سمجھا کہ خدا یا کسی مافوق الطبیعت (SUPERNATURAL) ہستی کو فرض کیے بغیر کائنات کے معمّے کو حل کرنے کی کوشش کریں اور ہر اس طریقے کو خلاف حکمت (UNSCIENTIFIC) قرار دیں جس میں خدا کا وجود فرض کر کے مسائل کائنات پر نظر کی گئی ہو۔ اس طرح نئے دَور کے اہلِ حکمت و فلسفہ میں خدا اور روح یا روحانیت اور فوق الطبیعت کے خلاف ایک تعصب پیدا ہو گیا۔ جو عقل و استدلال کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ سراسر جذبات کی برانگیختگی کا نتیجہ تھا۔ وہ خدا سے اس لیے تبرّی نہ کرتے تھے کہ دلائل و براہین سے اس کا عدم وجوب ثابت ہو گیا تھا۔ بلکہ اس سے بیزار تھے کہ وہ ان کی آزادیٔ خیال کے دشمنوں کا معبود تھا۔ بعد کی پانچ صدیوں میں ان کی عقل و فکر اور ان کی علمی جدوجہد نے جتنا کام کیا اس کی بنیاد میں یہی غیر عقلی جذبہ تھا۔

مغربی فلسفہ اور مغربی سائنس دونوں نے جب سفر شروع کیا تو اگرچہ ان کا رُخ خدا پرستی کے بالکل مخالف سمت میں تھا تاہم چونکہ وہ مذہبی ماحول میں گھرے

ہوئے تھے اس لیے وہ ابتداً نیچریت (NATURALISM) کو خدا پرستی کے ساتھ ساتھ نباہتے رہے۔ مگر جوں جوں وہ اپنے سفر میں آگے بڑھتے گئے، نیچریت، خدا پرستی پر غالب آتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ خدا کا تخیل، اور خدا کے ساتھ ہر اس چیز کا تخیل جو عالمِ طبیعت سے بالاتر ہو، ان سے بالکل غائب ہو گیا۔ اور وہ اس انتہا پر پہنچ گئے کہ مادّہ و حرکت کے سوا کوئی شئے ان کے نزدیک حقیقی نہ رہی۔ سائنس نیچریت کا ہم معنیٰ قرار پا گیا اور اہلِ حکمت و فلسفہ کا ایمان اس نظریئے پر قائم ہو گیا کہ ہر چیز جو ناپی اور تولی نہیں جا سکتی اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔

مغربی فلسفہ و سائنس کی تاریخ اس بیان کی شاہد ہے۔ ڈیکارٹ (DESCARTES) متوفی ۱۶۵۰ء جو مغربی فلسفے کا آدم سمجھا جاتا ہے ایک طرف تو خدا کا زبردست قائل ہے اور مادّہ کے ساتھ روح کا مستقل وجود بھی مانتا ہے مگر دوسری طرف وہی ہے جس نے عالمِ طبیعت کے آثار کی توجیہہ میکانکی (MECHANICAL) طریق پر کرنے کی ابتداء کی اور طریقِ فکر کی بنا رکھی جو بعد میں سراسر مادّہ پرستی (MATERIALISM) بن گیا۔ ہابس (HOBBES) ۱۶۷۹ء اس سے ایک قدم اور آگے بڑھا کر فوق الطبیعت (SUPERNATURAL) ہستی کی کھلم کھلا مخالفت کرتا ہے۔ نظامِ عالم اور اس کی ہر شے کو میکانکی توجیہہ کے قابل قرار دیتا ہے اور کسی ایسی نفسی یا روحی یا عقلی قوّت کا قائل نہیں ہے، جو اس مادّی دنیا میں تصرّف کرنے والی ہو مگر اس کے ساتھ ہی وہ خدا کو بھی مانتا ہے۔ اس حیثیت سے کہ ایسی ایک علّت العلل کا ماننا ایک عقلی ضرورت ہے۔ اسی زمانے میں اسپائنوزا (SPINOZA) ۱۶۷۷ء میں اُٹھا جو سترھویں صدی میں عقلیت (RATIONALISM) کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔ اس نے مادّہ اور روح اور خدا کے درمیان کوئی فرق نہ رکھا۔ خدا اور کائنات کو ملا کر ایک

کُل بنا دیا۔ اور اس کُل میں خدا کے اختیارِ مطلق کو تسلیم نہ کیا۔ لائبنز (LEIBNITZ) [illegible] اور لاک (LOCKE) [illegible] خدا کے قائل تھے، مگر دونوں کا میلان نیچریت کی جانب تھا۔

یہ سترھویں صدی کا فلسفہ تھا۔ جس میں خدا پرستی اور نیچریت دونوں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ اسی طرح سائنس نے بھی سترھویں صدی تک کامل الحاد کا رنگ اختیار نہیں کیا۔ کوپرنکس (COPERNICUS) کپلر (KEPLER) گیلیلیو (GALILEO) نیوٹن (NEWTON) اور سائنس کے دوسرے علمبرداروں میں سے کوئی بھی خدا کا منکر نہ تھا۔ مگر یہ کائنات کے اسرار کی جستجو میں الٰہی نظریئے سے قطع نظر کر کے ان قوتوں کو تلاش کرنا چاہتے تھے جو اس نظام کو چلا رہی ہیں۔ اور ان قوانین کو معلوم کرنے کے خواہش مند تھے۔ جن کے تحت یہ نظام چل رہا ہے۔ یہ الٰہی نظریئے سے قطع نظر کرنا ہی دراصل اس دہریت اور نیچریت کا تخم تھا۔ جو بعد میں حریتِ فکر کے درخت سے پیدا ہوئی۔ لیکن سترھویں صدی کے حکما کو اس کا شعور نہ تھا۔ وہ نیچریت اور خدا پرستی میں کوئی خطِ امتیاز نہ کھینچ سکے۔ اور یہی سمجھتے رہے کہ یہ دونوں ایک ساتھ نبھ سکتی ہیں۔

اٹھارھویں صدی میں یہ حقیقت نمایاں ہو گئی کہ جو طریق فکر خدا کی ہستی کو نظر انداز کر کے نظامِ کائنات کی جستجو کرے گا وہ مادیت بے دینی اور الحاد تک پہونچے بغیر نہ رہ سکے گا۔ اس صدی میں جان ٹولینڈ (JOHNTOLAND) ڈیوڈ ہارٹلے (DAVID HARTLEY) جوزف پریسٹلے (JOSEPHPRISTLAY) والٹیر (VALTAIRE) لامیٹری (LAMETTRIE) ہولباخ (HOLBACH) کیبانیس (CABANIS) ڈینس ڈائیڈرو (DONISDIDEROT) مانٹسکیو (MONTESQUIEU) روسو

(ROUSSEAU) اور ایسے ہی دوسرے آزاد خیال فلاسفہ و حکماء پیدا ہوئے جنھوں نے یا تو علانیہ خدا کے وجود سے انکار کیا یا اگر بعض نے اسے تسلیم کیا بھی تو اس کی حیثیت ایک دستوری فرمانروا CONSTITUTIONAL MONARCH سے زیادہ نہ سمجھی جو نظامِ کائنات کو ایک مرتبہ حرکت میں لے آنے کے بعد گوشہ نشین ہو گیا ہے۔ اور اب اس نظام کے چلانے میں اس کا کوئی حصّہ نہیں ہے یہ لوگ عام طبیعت اور دنیائے مادّہ و حرکت کے باہر کسی چیز کے وجود کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اور ان کے نزدیک حقیقت صرف انہی چیزوں کی تھی جو ہمارے مشاہدے اور تجربے میں آتی ہیں۔ ہیوم نے (HUME) اپنی تجربیت (EMPIRICISM) اور فلسفۂ تشکیک (SCEPTICISM) سے اس طریقِ فکر کی زبردست تائید کی۔ اور معقولات کی صحت کے لیے بھی تجربے ہی کو معیار قرار دینے پر زور دیا۔ برکلے (BERKELEY) نے مادیت کی اس بڑھتی ہوئی رَو کا جان توڑ مقابلہ کیا۔ مگر وہ اس کو نہ روک سکا۔ ہیگل (HEGAL) نے مادیت کے مقابلے میں تصوّرات (IDEALISM) کو فروغ دینا چاہا، مگر ٹھوس مادّے کے مقابلے میں لطیف تصوّر کی پرستش نہ ہوئی۔ کانٹ (KANT) نے بیچ کی راہ نکالی کہ خدا کی ہستی، روح کا بقا اور ارادے کی آزادی ان چیزوں میں سے نہیں ہے جو ہمارے علم میں آسکیں۔ یہ چیزیں جانی نہیں جاسکتیں۔ تاہم ان پر ایمان لایا جاسکتا ہے اور حکمتِ عملی (PRACTICAL WISDOM) اس کی مقتضی ہے کہ ان پر ایمان لایا جائے۔ یہ خدا پرستی اور نیچریت کے درمیان مصالحت کی آخری کوشش تھی لیکن ناکام ہوئی۔ کیونکہ جب عقل و فکر کی گمراہی نے خدا کو محض وہم کی پیداوار یا حد سے حد ایک معطل بے اختیار ہستی قرار دے دیا تو محض اخلاق کی حفاظت کے لیے

اس کو ماننا اس سے ڈرنا اور اس کی خوشنودی چاہنا، سراسر ایک غیر عاقلانہ فعل تھا۔
انیسویں صدی میں مادیت اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ فوگت (VOGT) بوخنر (BUCHNER) تسولبے (CZOLBE) کومت (COMTE) مولشات (MOLESCHOTTE) اور دوسرے حکماء اور فلاسفہ نے مادہ اور اس کے خواص کے سوا ہر شے کے وجود کو باطل قرار دیا۔ مل (MILL) نے فلسفے میں تجربیت اور اخلاق میں افادیت (UTILITARIANISM) کو فروغ دیا۔ اسپنسر (SPENCER) نے فلسفیانہ ارتقائیت اور نظامِ کائنات کے خود بخود پیدا ہونے اور زندگی کے آپ سے آپ رونما ہو جانے کا نظریہ پوری قوت کے ساتھ پیش کیا۔ حیاتیات (BIOLOGY) عضویات (PHYSIOLOGY) ارضیات (GEOLOGY) اور حیوانیات (ZOOLOGY) کے اکتشافات، عملی سائنس کی ترقی اور مادی وسائل کی کثرت نے یہ خیال پوری پختگی کے ساتھ دلوں میں راسخ کر دیا کہ کائنات آپ سے آپ وجود میں آئی ہے، کسی نے اس کو پیدا نہیں کیا۔ آپ سے آپ بندھے قوانین کے تحت چل رہی ہے، کوئی اس کو چلانے والا اور ان قوانین کا نافذ کرنے والا نہیں ہے۔ آپ سے آپ ترقی کے منازل طے کرتی رہی ہے۔ کسی فوق الطبیعت ہستی کا ہاتھ اس خود بخود حرکت والی مشین میں کام نہیں کر رہا ہے۔ بے جان مادے میں جان کسی کے امر سے نہیں پڑتی بلکہ خود مادہ جب اپنے نظم میں ترقی کرتا ہے تو اس میں جان پڑ جاتی ہے۔ نمو، حرکت ارادی، احساس، شعور، فکر سب اسی ترقی یافتہ مادے کے خواص ہیں۔ حیوان اور انسان سب کے سب مشینیں ہیں جو طبعی قوانین کے تحت چل رہی ہیں۔ ان مشینوں کے پرزے جس طور سے ترتیب پاتے ہیں اسی طور کے افعال ان سے صادر ہوتے

ہیں۔ ان میں کوئی اختیار کوئی آزاد ارادہ (FREEWILL) نہیں ہے۔ ان کے نظام کا درہم برہم ہو جانا، اُن کی انرجی کا خرچ ہو جانا ہی اُن کی موت ہے۔ جو فنائے محض کا ہم معنی ہے۔ جب مشین ٹوٹ پھوٹ گئی تو اس کے خواص بھی باطل ہو گئے۔ اب ان کے لیے حشر اور بارِ دیگر پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

ڈارون کے نظریۂ ارتقاء نے اس نیچریت اور مادیت کو استحکام بخشنے اور ایک مدلّل اور منظم علمی نظریئے کی حیثیت دینے میں سب سے بڑھ کر حصّہ لیا۔ اس کی کتاب اصل الانواع (ORIGIN OF SPECIES) جو ۱۸۵۹ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی سائنس کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کرنے والی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس نے ایک ایسے طریقِ استدلال سے جو انیسویں صدی کے سائنٹفک دماغوں کے نزدیک استدلال کا محکم ترین طریقہ تھا۔ اس نظریئے پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ کائنات کا کاروبار خدا کے بغیر چل سکتا ہے۔ آثار و مظاہرِ فطرت کے لیے خود فطرت کے قوانین کے سوا کسی اور علّت کی حاجت نہیں۔ زندگی کے ادنیٰ مراتب سے لے کر اعلیٰ مراتب تک موجودات کا ارتقاء ایک ایسی فطرت کے تدریجی عمل کا نتیجہ ہے جو عقل و حکمت کے جواہر سے عاری ہے۔ انسان اور دوسری انواعِ حیوانی کو پیدا کرنے والا کوئی صانعِ حکیم نہیں ہے، بلکہ وہی ایک جاندار مشین جو کبھی کیڑے کی شکل میں رینگا کرتی تھی۔ تنازع للبقاء، بقائے اصلح، اور انتخابِ طبیعی کے نتیجے کے طور پر ذی شعور اور ناطق انسان کی شکل میں نمودار ہو گئی۔

یہی وہ فلسفہ اور سائنس ہے، جس نے مغربی تہذیب کو پیدا کیا ہے اس میں نہ کسی علیم و قدیر خدا کے خوف کی گنجائش ہے نہ نبوت اور وحی و الہام کی ہدایت کا

کوئی وزن نہ موت کے بعد کسی دوسری زندگی کا تصوّر، نہ حیاتِ دنیا کے حساب وکتاب کا کوئی کھٹکا۔ نہ انسان کی ذاتی ذمّے داری کا کوئی سوال، نہ زندگی کے حیوانی مقاصد سے بالاتر کسی مقصد اور کسی نصب العین کا کوئی امکان، یہ خالص مادّی تہذیب ہے۔ اس کا پورا نظام خدا ترسی، راست روی، صداقت پسندی، حق جوئی، حُسنِ اخلاق، دیانت، امانت، نیکی، حیا، پرہیزگاری اور پاکیزگی کے ان تصوّرات سے خالی ہے، جن پر اسلامی تہذیب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس کا نظریہ اسلام کے نظریے کی بالکل ضد ہے، اس کا راستہ اس راستے کی عین مخالف سمت میں ہے جو اسلام نے اختیار کیا ہے۔ اسلام جن چیزوں پر انسانی اخلاق اور تمدّن کی بنا رکھتا ہے ان کو یہ تہذیب بیخ وبُن سے اُکھاڑ دینا چاہتی ہے، اور یہ تہذیب جن بنیادوں پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی عمارت قائم کرتی ہے ان پر اسلام کی عمارت ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ٹھیر سکتی۔ گویا اسلام اور مغربی تہذیب دو ایسی کشتیاں ہیں جو بالکل مخالف سمتوں میں سفر کر رہی ہیں جو شخص ان میں سے کسی ایک کشتی پر سوار ہو گا اسے لامحالہ دوسری کشتی کو چھوڑنا پڑے گا۔ اور جو بیک وقت ان دونوں پر سوار ہو گا اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔

اس کو بدقسمتی کے سوا اور کیا کہیے کہ جس صدی میں یہ نئی تہذیب اپنی مادّہ پرستی، الحاد اور دہریت کی انتہا کو پہنچی، ٹھیک وہی صدی تھی جس میں مراکش سے لے کر مشرقِ اقصٰے تک تمام اسلامی ممالک مغربی قوموں کے سیاسی اقتدار اور حاکمانہ استیلاء سے مغلوب ہوئے۔ مسلمانوں پر مغربی تلوار اور قلم دونوں کا حملہ ایک ساتھ ہوا۔ جو دماغ مغربی طاقتوں کے سیاسی غلبے سے مرعوب اور دہشت زدہ

ہو چکے تھے ان کے لیے مشکل ہو گیا کہ مغرب کے فلسفہ و سائنس اور ان کی پروردہ تہذیب کے رعب و داب سے محفوظ رہتے۔ خصوصیت کے ساتھ ان مسلمان قوموں کی حالت اور بھی زیادہ نازک تھی جو براہِ راست کسی مغربی سلطنت کے زیرِ حکم آگئی تھیں۔ ان کو اپنے دنیوی مفاد کی حفاظت کے لیے مجبوراً مغربی علوم حاصل کرنے پڑے اور چونکہ یہ تحصیلِ علوم خالص علم کی خاطر نہ تھی اور مزید برآں ایک مرعوب ذہنیت کے ساتھ مغربی استادوں کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا گیا تھا۔ اس لیے مسلمانوں کی کئی نسلوں نے شدت کے ساتھ مغربی افکار اور سائنٹیفک نظریات کا اثر قبول کیا۔ اُن کی ذہنیتیں مغربی سانچے میں ڈھلتی چلی گئیں۔ ان کے دلوں میں مغربی تہذیب کا تصوّر بڑھتا چلا گیا۔ ان میں وہ ناقدانہ نظر پیدا ہی نہیں ہوئی۔ جس سے وہ صحیح اور غلط کو پرکھتے۔ اور صرف صحیح کو اختیار کرتے۔ ان میں یہ صلاحیت ہی نہ پیدا ہو سکی کہ آزادی اور استقلال کے ساتھ غور و فکر کرتے اور اپنے ذاتی اجتہاد سے کوئی رائے قائم کرتے۔ اسی کا نتیجہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسلامی تہذیب جن بنیادوں پر قائم ہے وہ متزلزل ہو گئی ہیں۔ ذہنیتوں کا وہ سانچہ بگڑ گیا ہے جس سے اسلامی طریق پر سوچا اور سمجھا جا سکتا تھا۔ مغربی طریق پر سوچنے اور مغربی تہذیب کے اصولوں پر اعتقاد رکھنے والے دماغوں کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اس میں اسلام کے اصول ٹھیک نہیں بیٹھ سکتے، اور جب اصول ہی اس میں نہیں سما سکتے تو فروع میں طرح طرح کے شبہات اور نت نئے شکوک پیدا ہونا ہرگز قابلِ تعجب نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کا سوادِ اعظم اب بھی اسلام کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے اور مسلمان رہنا چاہتا ہے۔ لیکن دماغ مغربی افکار اور مغربی تہذیب

سے متاثر ہو کر اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں، اور یہ انحراف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ سیاسی غلبہ و استیلاء سے قطعِ نظر مغرب کا علمی اور فکری داب و تسلّط دنیا کی ذہنی فضا پر چھایا ہوا ہے اور اس نے نگاہوں کے زاویئے اس طرح بدل دیئے ہیں کہ دیکھنے والوں کے لیے مسلمان کی نظر سے دیکھنا اور سوچنے والوں کے لیے اسلامی طریق پر سوچنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ اشکال اس وقت تک دور نہ ہو گا جب تک مسلمانوں میں آزاد اہلِ فکر پیدا نہ ہوں گے۔ اسلام میں ایک نشاۃِ جدیدہ (RENAISSANCE) کی ضرورت ہے۔ پرانے اسلامی مفکّرین و محققین کا سرمایہ اب کام نہیں دے سکتا۔ دنیا اب بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ اس کو اب اُلٹے پاؤں ان منازل کی طرف واپس لے جانا ممکن نہیں ہے۔ جن سے وہ چھ سو برس پہلے گزر چکی ہے۔ علم و عمل کے میدان میں رہنمائی وہی کر سکتا ہے جو دنیا کو آگے کی جانب چلائے نہ کہ پیچھے کی جانب۔ لہٰذا اب اگر اسلام دوبارہ دنیا کا رہنما بن سکتا ہے تو اس کی بس یہی صورت ہے کہ مسلمانوں میں ایسے مفکّر اور محقق پیدا ہوں جو فکر و نظر اور تحقیق و اکتشاف کی قوت سے ان بنیادوں کو ڈھا دیں، جن پر مغربی تہذیب کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ قرآن کے بتائے ہوئے طریق فکر و نظر پر آثار کے مشاہدے اور حقائق کی جستجو سے ایک نئے نظامِ فلسفہ کی بنا رکھیں، جو خالص اسلامی فکر کا نتیجہ ہو۔ ایک نئی حکمتِ طبیعی (NATURAL SCIENCE) کی عمارت اٹھائیں جو قرآن کی ڈالی ہوئی داغ بیل پر اُٹھے۔ ملحدانہ نظریے کو توڑ کر الٰہی نظریے پر فکر و تحقیق کی اساس قائم کریں اور اس جدید فکر و تحقیق کی عمارت کو اس قوت کے ساتھ اٹھائیں کہ وہ تمام دنیا پر چھا جائے اور دنیا میں مغرب کی مادّی تہذیب کے بجائے اسلام کی حقانی تہذیب جلوہ گر ہو۔

یہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کے مقصد و مدعا کو تمثیل کے پیرائے میں یوں سمجھیے کہ دنیا گویا ایک ریل گاڑی ہے جس کو فکر و تحقیق کا انجن چلا رہا ہے اور مفکرین و محققین اس انجن کے ڈرائیور ہیں۔ یہ گاڑی ہمیشہ اسی رُخ پر سفر کرتی ہے۔ جس رُخ پر ڈرائیور اس کو چلاتے ہیں۔ جو لوگ اس میں بیٹھے ہیں وہ مجبور ہیں کہ اسی طرف جائیں جس طرف گاڑی جا رہی ہے۔ خواہ وہ اس طرف جانا چاہیں یا نہ چاہیں۔ اگر اس گاڑی میں کوئی ایسا مسافر بیٹھا ہی جو اس راہ پر نہیں جانا چاہتا تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ چلتی ہوئی گاڑی ہی میں بیٹھے بیٹھے اپنی نشست کا رُخ آگے کے بجائے پیچھے یا دائیں بائیں پھیر دے مگر نشست کا رُخ بدل دینے سے وہ اپنے سفر کا رُخ نہیں بدل سکتا۔ سفر کا رُخ بدلنے کی صورت اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ انجن پر قبضہ کیا جائے۔ اور اس کی رفتار کو اس جانب پھیر دیا جائے جو مطلوب ہے۔ اس وقت جو لوگ انجن پر قابض ہیں وہ سب خدا سے پھرے ہوئے ہیں اور فکرِ اسلامی سے بے بہرہ ہیں اس لیے گاڑی اپنے مسافروں کو لیے ہوئے الحاد اور مادّہ پرستی کی طرف دوڑی چلی جا رہی ہے اور سب مسافر طوعاً و کرہاً اسلام کی منزلِ مقصود سے دُور اور دُور تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اب اس رفتار کو بدلنے کے لیے ضرورت ہے کہ خدا پرستوں میں سے کچھ باہمت مرد اُٹھیں اور جدوجہد کر کے انجن کو ان ملحدین کے ہاتھوں سے چھین لیں جب تک یہ نہ ہوگا گاڑی کا رُخ نہ بدلے گا۔ اور وہ ہمارے جھلانے بگڑنے اور شور مچانے کے باوجود اسی راہ پر سفر کرتی رہے گی جس پر ناخدا شناس ڈرائیور اس کو چلا رہے ہیں۔

(ترجمان القرآن، جمادی الاخری ۵۳ھ م ستمبر ۱۹۳۴ء)

ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا انحطاط

دنیائے اسلام کا بیشتر حصہ ان ممالک پر مشتمل ہے جو صدرِ اوّل کے مجاہدین کی کوششوں سے فتح ہوئے ان کو جن لوگوں نے فتح کیا تھا وہ ملک گیری اور حصولِ غنائم کے لیے نہیں بلکہ خدا کے کلمے کو دنیا میں بلند کرنے کے لیے سروں سے کفن باندھ کر نکلے تھے۔ وہ طلبِ دنیا کے بجائے طلبِ آخرت کے نشے میں سرشار تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے مفتوحین کو مطیع و باج گزار بنانے پر اکتفا نہ کیا بلکہ انھیں اسلام کے رنگ میں رنگ دیا۔ ان کی پوری آبادی یا ان کے سوادِ اعظم کو ملتِ حنیفی میں جذب کر لیا۔ علم و عمل کی قوت سے ان میں اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب کو اتنا راسخ کر دیا کہ وہ خود تہذیبِ اسلامی کے علمبردار اور علومِ اسلامی کے معلّم بن گئے۔ ان کے بعد وہ ممالک ہیں جو اگرچہ صدرِ اوّل کے بعد اس عہد میں فتح ہوئے جب کہ اسلامی جوش سرد ہو چکا تھا اور فاتحین کے دلوں میں خالص جہاد فی سبیل اللہ کی رُوح سے زیادہ ملک گیری کی ہوس نے جگہ لے لی تھی، لیکن اس کے باوجود اسلام وہاں پھیلنے اور جڑ پکڑنے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے ان ممالک میں کلیۃً ایک قومی مذہب اور قومی تہذیب کی حیثیت حاصل کر لی۔

بدقسمتی سے ہندوستان کا معاملہ ان دونوں قسم کے ممالک سے مختلف ہے۔ صدرِ اوّل میں اس ملک کا بہت تھوڑا سا حصہ فتح ہوا تھا اور اس تھوڑے سے حصے پر

بھی جو کچھ اسلامی تعلیم و تہذیب کے اثرات پڑے تھے ان کو باطنیت کے سیلاب نے ملیامیٹ کر دیا۔ اس کے بعد جب ہندوستان میں مسلمانوں کی فتوحات کا اصلی سلسلہ شروع ہوا تو فاتحوں میں صدرِ اوّل کے سے مسلمانوں کی خصوصیات باقی نہیں رہی تھیں۔ انھوں نے یہاں اشاعتِ اسلام کے بجائے توسیعِ مملکت میں اپنی قوتیں صرف کیں۔ اور لوگوں سے اطاعتِ خدا و رسولؐ کے بجائے اپنی اطاعت و باجگذاری کا مطالبہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدیوں کی فرمانروائی کے بعد بھی ہندوستان کا سوادِ اعظم غیر مسلم رہا۔ یہاں اسلامی تہذیب جڑ نہ پکڑ سکی، یہاں کے باشندوں میں جنہوں نے اسلام قبول کیا ان کی اسلامی تعلیم و تربیت کا بھی کوئی خاص انتظام نہ کیا گیا۔ نو مسلم جماعتوں میں قدیم ہندوانہ خیالات اور رسم و رواج کم و بیش باقی رہے اور خود باہر کے آئے ہوئے قدیم الاسلام مسلمان بھی اہلِ ہند کے میل جول سے مشرکانہ طریقوں کے ساتھ رواداری برتنے اور بہت سی جاہلانہ رسوم کا اتباع کرنے لگے۔

اسلامی ہند کی تاریخ اور اس کے موجودہ حالات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس زمانے میں اس ملک پر مسلمانوں کا سیاسی اقتدار پوری قوت سے چھایا ہوا تھا اس زمانے میں یہاں اسلام کے اثرات کمزور تھے اور یہاں کا ماحول خالص اسلامی ماحول نہ تھا۔ اگرچہ ہندوؤں کا مذہب اور تمدن بالذات ضعیف تھا۔ اور محکوم و مغلوب قوم کا مذہب و تمدن ہونے کی حیثیت سے اور بھی زیادہ ضعیف ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی مسلمان حکمرانوں کی "رواداری" اور غفلت کی بدولت وہ ملک کے سوادِ اعظم پر چھایا ہوا رہا اور ہندوستان کی فضا پر اس کے مستولی ہونے اور خود مسلمانوں کی اسلامی تعلیم و تربیت مکمل نہ ہونے کی وجہ سے یہاں کے مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ

اپنے عقائد اور اپنی تہذیب میں کبھی اتنا صحیح اور پختہ اور کامل مسلمان نہ ہو سکا جتنا وہ خالص اسلامی ماحول میں ہو سکتا تھا۔

اٹھارھویں صدی عیسوی میں وہ سیاسی اقتدار بھی مسلمانوں سے چھن گیا جو ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا سہارا تھا۔ پہلے مسلمانوں کی سلطنت منفرق ہو کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوئی۔ پھر مرہٹوں اور سکھوں اور انگریزوں کے سیلاب نے ایک ایک کر کے ان ریاستوں میں سے بیشتر کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد قضاء الٰہی نے انگریزوں کے حق میں اس ملک کی حکومت کا فیصلہ صادر کیا اور ایک صدی سے زیادہ زمانہ گزرا تھا کہ مسلمان اس سرزمین میں مغلوب و محکوم ہو گئے جس پر انھوں نے صدیوں حکومت کی تھی۔ انگریزی سلطنت جتنی جتنی پھیلتی گئی مسلمانوں سے ان طاقتوں کو چھینتی چلی گئی جن کے بل پر ہندوستان میں اسلامی تہذیب کسی حد تک قائم تھی، اس لئے فارسی اور عربی کے بجائے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا اسلامی قوانین کو منسوخ کیا، شرعی عدالتیں توڑ دیں، دیوانی اور فوجداری معاملات میں خود اپنے قوانین جاری کیے، اسلامی قانون کے نفاذ کو خود مسلمانوں کے حق میں صرف نکاح و طلاق وغیرہ تک محدود کر دیا۔ اور اس محدود نفاذ کے اختیارات بھی مسلمان قاضیوں کے بجائے عام دیوانی عدالتوں کے سپرد کر دیئے جن کے حکام عموماً غیر مسلم ہوتے ہیں اور جن کے ہاتھوں "محمڈن لا" روز بروز مسخ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ ابتداء سے انگریزی حکومت کی یہ پالیسی رہی کہ معاشی حیثیت سے پامال کر کے ان کے اس قومی فخر و ناز کو کچل ڈالے جو ایک حاکم قوم کی حیثیت سے صدیوں تک ان کے دلوں میں پرورش پاتا رہا ہے۔ چنانچہ ایک صدی کے اندر اندر اس پالیسی کی بدولت اس قوم کو مفلس، جاہل،

پست خیال، فاسد الاخلاق اور ذلیل و خوار کر کے چھوڑا گیا۔

اس گرتی ہوئی قوم پر آخری ضرب وہ تھی جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں لگی اس نے مسلمانوں کی صرف سیاسی قوت ہی کا خاتمہ نہیں کیا۔ بلکہ ان کی ہمتوں کو توڑ دیا۔ ان کے دلوں پر مایوسی اور احساسِ ذلت کی تاریک گھٹائیں مسلّط کر دیں ان کو انگریزی اقتدار سے اتنا مرعوب کیا کہ ان میں قومی خودداری کا شائبہ تک باقی نہ رہا اور ذلّت و خواری کی انتہائی گہرائیوں میں پہونچ کر وہ ایسا سمجھنے پر مجبور ہو گئے۔ کہ دنیا میں سلامتی حاصل کرنے کا ذریعہ انگریز کی تقلید کے سوا اور کوئی نہیں ہے اور ان کا اپنا سرمایۂ علم و تہذیب جو کچھ بھی ہے ذلیل سبب ذلت اور موجب نجست ہے۔

انیسویں صدی کے نصفِ دوم میں جب مسلمانوں نے سنبھل کر پھر اُٹھنے کی کوشش کی تو وہ دو قسم کی کمزوریوں میں مبتلا تھے۔

ایک یہ کہ وہ فکر و عمل کے اعتبار سے پہلے ہی اسلامی عقائد اور تہذیب میں پختہ نہ تھے اور ایک غیر اسلامی ماحول اپنے جاہلی افکار اور تمدن کے ساتھ ان کو گھیرے ہوئے تھا۔

دوسرے یہ کہ غلامی اپنے تمام معائب کے ساتھ نہ صرف ان کے جسم پر بلکہ ان کے قلب و روح پر بھی مسلّط ہو چکی تھی۔ اور وہ ان تمام قوتوں سے محروم کر دیئے گئے تھے جن سے کوئی قوم اپنے تمدن و تہذیب کو برقرار رکھ سکتی ہے۔

اس دوہری کمزوری کی حالت میں مسلمانوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو انھیں نظر آیا کہ انگریزی سلطنت نے اپنی ہوشیاری سے معاشی ترقی کے تمام دروازے بند کر دیئے ہیں اور ان کی کنجی انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں رکھ دی ہے۔ اب مسلمانوں کے

لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کریں۔ چنانچہ مرحوم سرسید احمد خاں کی رہنمائی میں ایک زبردست تحریک اٹھی جس کے اثر سے ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا ہو گیا۔ پرانے لوگوں کی مخالفت بیکار ثابت ہوئی۔ دولت، عزت اور اثر کے لحاظ سے قوم کی اصلی طاقت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی انھوں نے اس نئی تحریک کا ساتھ دیا، ہندوستان کے مسلمان تیزی کے ساتھ انگریزی تعلیم کی طرف بڑھے۔ قوم کا تلچھٹ مذہبی مدرسوں کے لیے چھوڑ دیا گیا تاکہ مسجدوں کی امامت اور مکتبوں کی معلّمی کے کام آئے اور خوشحال طبقوں کے بہترین نونہال انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں بھیج دیئے گئے تاکہ ان کے دل و دماغ کے سادہ اوراق پر فرنگی علوم و فنون کے نقوش ثبت کیے جائیں۔

یہ انیسویں صدی کے آخری چوتھائی کا زمانہ تھا۔ یورپ میں اس وقت مادیّت اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ اٹھارہویں صدی میں سائنس پوری طرح مذہب کو شکست دے چکا تھا۔ جدید فلسفہ اور نئے علوم حکمت کی رہنمائی میں سیاسیات، معاشیات، اخلاقیات اور اجتماعیات کے پرانے نظریے باطل ہو کر نئے نظریے قائم ہو چکے تھے۔ یورپ میں ایک خاص تہذیب پیدا ہو چکی تھی۔ جس کی بنیاد کلیتہً انہی جدید نظریوں پر قائم تھی۔ اس انقلاب عظیم نے زندگی کے عملی معاملات سے تو مذہب اور ان اصولوں کو جو مذہبی رہنمائی پر مبنی تھے کلّی طور پر خارج کر ہی دیا تھا البتہ تخیّل کی دنیا میں مذہبی اعتقاد کی تھوڑی سی جگہ باقی رہ گئی تھی۔ سو اب اس کے خلاف زبردست جنگ جاری تھی۔ اگرچہ علوم حکمت میں سے کسی علم نے بھی کائنات کے الٰہی نظریئے کے خلاف کوئی ثبوت (جس کو "ثبوت" کہا جا سکتا ہو) بہم نہیں پہونچایا تھا۔ مگر اہلِ حکمت بغیر کسی دلیل کے محض

اپنے رجحانِ طبیعت کی بنا پر خدا سے بیزار اور الٰہی نظریئے کے دشمن تھے اور چونکہ انہی کو اس وقت دنیا کی عقلی و عملی امامت کا منصب حاصل تھا اس لیے ان کے اثر سے خدا سے بے زاری (THEOPHOBIA) کا مرض ایک عام وبا کی طرح پھیل گیا۔ وجودِ باری کا انکار کائنات کو آپ سے آپ پیدا ہونے والی اور آپ سے آپ قوانینِ طبعی کے تحت چلنے والی چیز سمجھنا خدا پرستی کو توہم (SUPERSTITION) قرار دینا، مذہب کو لغو اور مذہبیت کو تنگ نظری و تنگ خیالی کہنا اور نیچریت (NATURALISM) کو روشن خیالی کا ہم معنیٰ سمجھنا اس وقت فیشن میں داخل ہو چکا تھا۔ ہر شخص خواہ وہ فلسفہ و سائنس میں کچھ بھی دستگاہ نہ رکھتا ہو اور اس نے خود ان مسائل کی تحقیق میں ذرہ برابر بھی کوشش نہ کی ہو۔ صرف اس بنا پر ان خیالات کا اظہار کرتا تھا کہ سوسائٹی میں وہ ایک روشن خیال آدمی سمجھا جائے، روحانیت (SPRITUALISM) یا فوق الطبیعت (SUPER-NATURALISM) کی تائید میں کچھ کہنا اس وقت کفر کا درجہ رکھتا تھا۔ اگر کوئی بڑے سے بڑا سائنس داں بھی اس قسم کے کسی خیال کا اظہار کرتا تو سائنٹفک حلقوں میں اس کی ساری وقعت جاتی رہتی، اس کے تمام کارناموں پر پانی پھر جاتا۔ اور وہ اس قابل نہ رہتا کہ اسے کسی علمی جماعت کی رکنیت کا شرف بخشا جائے۔

۱۸۵۹ء میں ڈارون کی کتاب اصل الانواع (ORIGIN OF SPECIES) شائع ہوئی جس نے نیچریت اور دہریت کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ اگرچہ ڈارون کے دلائل جو اس نے اپنے مخصوص نظریۂ ارتقاء کی تائید میں پیش کیے تھے۔ کمزور اور محتاج ثبوت تھے۔ اس کے سلسلۂ ارتقاء میں ایک کڑی نہیں بلکہ ہر موجود کڑی کے آگے اور پیچھے بہت سی کڑیاں مفقود تھیں۔ اہلِ حکمت اس وقت بھی اس نظریئے سے مطمئن نہ تھے۔ حتیٰ کہ خود

اس کا سب سے بڑا وکیل ہکسلے (HUXLEY) بھی اس پر ایمان نہ لایا تھا۔ مگر اس کے باوجود محض خدا سے بیزاری کی بنا پر ڈاروینیت کو قبول کر لیا گیا۔ اس کی حد سے زیادہ تشہیر کی گئی۔ اور مذہب کے خلاف ایک زبردست آلے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ کیونکہ اس نظریے نے اہلِ حکمت کے زعمِ باطل میں اس دعوے کا ثبوت فراہم کیا تھا۔ (حالانکہ در اصل ایک دعویٰ کیا تھا جو محتاجِ ثبوت تھا) کہ کائنات کا نظام کسی فوق الطبیعی قوت کے بغیر خود بخود طبیعی قوانین کے تحت چل رہا ہے۔ اہلِ مذہب نے اس نظریے کی مخالفت کی، اور برٹش ایسوسی ایشن کے جلسے میں بشپ آف آکسفورڈ اور گلیڈ اسٹون نے اپنی خطابت کا پورا زور اس کے خلاف صرف کیا۔ مگر شکست کھائی اور آخر کار اہلِ مذہب سائنٹیفک دہریت سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ ۱۸۸۲ء میں جب ڈاروِن نے وفات پائی تو چرچ آف انگلینڈ نے سب سے بڑا اعزاز اس کو بخشا جو اس کے اختیار میں تھا۔ یعنی اسے ویسٹ منسٹر ایبی میں دفن کرنے کی اجازت دی۔ حالانکہ وہ یورپ میں مذہب کی قبر کھودنے والوں کا سرخیل تھا۔ اور اس نے افکار کو الحاد، زندقہ اور بے دینی کی طرف چلانے اور وہ ذہنیت پیدا کرنے میں سب سے زیادہ حصّہ لیا تھا۔ جس نے آخر کار بولشوزم اور فاشزم کو پھلنے پھولنے اور بار آور ہونے کا موقع دیا۔

یہ زمانہ تھا جب ہماری قوم کے نوجوان انگریزی تعلیم اور فرنگی تہذیب سے استفادہ کرنے کے لیے مدرسوں اور کالجوں میں بھیجے گئے۔ اسلامی تعلیم سے کورے اسلامی تہذیب میں خام، انگریزی حکومت سے مرعوب، فرنگی تہذیب کی شان و شوکت پر فریفتہ پہلے ہی سے تھے۔ اب جو انھوں نے انگریزی مدرسے کی فضا میں قدم رکھا تو پہلا اثر یہ ہوا کہ ان کی ذہنیت کا سانچہ بدلا اور ان کی طبیعت کا رخ مذہب

سے پھر گیا۔ کیونکہ اس آب و ہوا کی اوّلین تاثیر یہ تھی کہ یورپ کے کسی مصنّف یا محقق کے نام سے جو چیز پیش کی جائے اس پر وہ بے تامّل اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا کہیں۔ اور قرآن وحدیث یا ائمہ دین کی طرف سے کوئی بات پیش ہو تو اس پر دلیل کا مطالبہ کریں۔

اس منقلب ذہنیت کے ساتھ انھوں نے جن مغربی علوم کی تعلیم حاصل کی ان کے اصول و فروع اکثر و بیشتر اسلام کے اصول اور جزئیات احکام کے خلاف تھے۔ اسلام میں مذہب کا تصوّر یہ ہے کہ وہ زندگی کا قانون ہے اور مغرب میں مذہب کا تصوّر یہ ہے کہ وہ محض ایک شخصی اعتقاد ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام میں پہلی چیز ایمان باللہ ہے اور وہاں سرے سے اللہ کا وجود ہی مسلم نہیں۔ اسلام کا پورا نظام تہذیب وحی و رسالت کے اعتقاد پر قائم ہے اور وہاں وحی کی حقیقت ہی میں شک اور رسالت کے منجانب اللہ ہونے ہی میں شبہ ہے۔ اسلام میں آخرت کا اعتقاد پورے نظامِ اخلاق کا سنگِ بنیاد ہے۔ اور وہاں یہ بنیاد خود بے بنیاد نظر آتی ہے۔ اسلام میں جو عبادات اور اعمالِ فرض ہیں وہاں محض عہدِ جاہلیت کے رسوم ہیں، جن کا اب کوئی عملی فائدہ نہیں۔ اسی طرح اسلام کے اصولِ تمدّن و تہذیب بھی مغربی تہذیب و تمدّن کے اصول سے یکسر مختلف ہیں۔ قانون میں اسلام کا اصل الاصول یہ ہے کہ خدا خود واضع قانون ہے، رسولِ خدا شارحِ قانون اور انسان صرف متبع قانون۔ مگر وہاں خدا کو وضع قانون کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں۔ لیجسلیچر واضعِ قانون ہے اور قوم لیجسلیچر کو منتخب کرنے والی ہے۔ سیاسیات میں اسلام کا مطمحِ نظر حکومتِ الٰہی ہے اور مغرب کا مطمحِ نظر حکومتِ قومی۔ اسلام کا رُخ بین الاقوامیت (INTERNATIONALISM) کی طرف ہے اور مغرب کا کعبۂ مقصود قومیت (NATIONALISM) معاشیات میں اسلام اکلِ حلال اور زکوٰۃ و صدقات اور تحریمِ سود

بڑھا دیتا ہے۔ اور مغرب کا سارا نظامِ معاشی ہی سود اور منافع پر چل رہا ہے۔ اخلاقیات میں اسلام کے پیشِ نظر آخرت کی کامیابی ہے اور مغرب کے پیشِ نظر دنیا کا فائدہ۔ اجتماعی مسائل میں بھی اسلام کا راستہ قریب قریب ہر معاملہ میں مغرب کے راستے سے مختلف ہے۔ ستر و حجاب، حدودِ زن و مرد، تعددِ ازدواج، قوانینِ نکاح و طلاق، ضبطِ ولادت، حقوقِ ذوی الارحام، حقوقِ زوجین اور ایسے ہی دوسرے بہت سے معاملات ہیں جن میں ان دونوں کا اختلاف نمایاں ہے کہ بیان کی حاجت نہیں۔ اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے اصول مختلف ہیں۔ ہمارے نوجوانوں نے مرعوب بلکہ غلامانہ ذہنیت اور پھر غیر مکمل اسلامی تعلیم و تربیت کے ساتھ جب ان مغربی علوم کی تحصیل کی اور مغربی تہذیب کے زیرِ اثر تربیت پائی تو نتیجہ جو کچھ ہونا چاہیے تھا وہی ہوا۔ ان میں تنقید کی صلاحیت پیدا نہ ہو سکی۔ انھوں نے مغرب سے جو کچھ سیکھا اس کو صحت اور درستی کا معیار سمجھ لیا۔ پھر ناقص علم کے ساتھ اسلام کے اصول و قوانین کو اس معیار پر جانچ کر دیکھا اور جس مسئلہ میں دونوں کے درمیان اختلاف پایا اس میں کبھی مغرب کی غلطی محسوس نہ کی بلکہ اسلام ہی کو برسرِ غلط سمجھا اور اس کے اصول و قوانین میں ترمیم و تنسیخ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

جدید تعلیم نے معاشی اور سیاسی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمانوں کو خواہ کتنا ہی فائدہ پہنچایا ہو مگر ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی کسی فائدے سے نہیں ہو سکتی۔

(ترجمان القرآن۔ رجب ۱۳۵۳ھ، اکتوبر ۱۹۳۴ء)

مرض اور اُس کا علاج!

اسلام محض ایک عقیدہ نہیں ہے، نہ وہ محض چند "مذہبی" اعمال اور رسموں کا مجموعہ ہے۔ بلکہ وہ انسان کی پوری زندگی کے لیے ایک مفصل اسکیم ہے۔ اس میں عقائد، عبادات اور عملی زندگی کے اصول و قواعد الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ سب مل کر ایک ناقابلِ تقسیم مجموعہ بناتے ہیں۔ جس کے اجزاء کا باہمی ربط بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ ایک زندہ جسم کے اعضا میں ہوتا ہے۔

آپ کسی زندہ آدمی کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیں۔ آنکھیں اور کان اور زبان جدا کر دیں، معدہ اور جگر نکال دیں، پھیپھڑے اور گردے الگ کر دیں اور دماغ بھی پورا یا کچھ کم و بیش کاسۂ سر سے خارج کر دیں اور بس ایک دل اس کے سینے میں رہنے دیں، کیا یہ باقی ماندہ حصۂ جسم زندہ رہ سکے گا ؟ اگر زندہ بھی رہے تو کیا وہ کسی کام کا ہوگا ؟

ایسا ہی حال اسلام کا بھی ہے۔ عقائد اس کا قلب ہیں۔ وہ طریقِ فکر (ATTITUDE OF MIND) نظریہ حیات (VIEW OF LIFE) مقصدِ زندگی اور معیارِ قدر (STANDARD OF VALUES) جو ان عقائد سے پیدا ہوتا ہے اس کا دماغ ہے۔ عبادات اس کے جوارح

اور قوائم ہیں جن کے بل پر وہ کھڑا ہوتا ہے، اور کام کرتا ہے۔ معیشت، معاشرت سیاست اور نظمِ اجتماعی کے تمام وہ اصول جو زندگی کے لیے اسلام نے پیش کیے ہیں، وہ اس کے لیے معدے اور جگر اور دوسرے اعضائے رئیسہ کا حکم رکھتے ہیں۔ اس کو صحیح و سالم آنکھوں اور بے عیب کانوں کی ضرورت ہے تاکہ وہ زمانے کے احوال وظروف کی ٹھیک ٹھیک رپورٹیں دماغ تک پہنچائیں اور دماغ ان کے متعلق صحیح حکم لگائے۔ اس کو اپنے قابو کی زبان درکار ہے تاکہ وہ اپنی خودی کا کما حقہٗ اظہار کرے۔ اس کو پاک و صاف فضا کی حاجت ہے جس سے وہ سانس لے سکے۔ اس کو طیب و طاہر غذا مطلوب ہے جو اس کے معدے سے مناسبت رکھتی ہو اور اچھا خون بنا سکے۔

اس پورے نظام میں اگرچہ قلب (یعنی عقیدہ) بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مگر اس کی اہمیت اسی لیے تو ہے کہ وہ تمام اعضاء وجوارح کو زندگی کی طاقت بخشتا ہے۔ جب اکثر و بیشتر اعضاء کٹ جائیں، جسم سے خارج کر دیے جائیں یا خراب ہو جائیں تو اکیلا قلب تھوڑے بہت بچے کھچے خستہ و بیمار اعضاء کے ساتھ کیسے زندہ رہ سکتا ہے؟ اور اگر زندہ بھی رہے تو اس زندگی کی کیا وقعت ہو سکتی ہے؟

اب آپ غور فرمائیں کہ اس وقت آپ اپنی اسی ہندوستان کی دنیا میں اسلام کو کس حال میں دیکھ رہے ہیں۔ قوانینِ اسلامی قریب قریب معطل ہیں۔ اخلاقیات میں، معاشرت میں، معیشت میں اور زندگی کے سارے معاملات میں اصولِ اسلامی کا نفاذ پانچ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے۔ غیر اسلامی ماحول، غیر اسلامی تربیت اور غیر اسلامی تعلیم نے دماغ کو کہیں بالکل اور کہیں کم و بیش غیر مسلم بنا دیا ہے۔ آنکھیں دیکھتی ہیں مگر ان

کا زاویہ بدل گیا ہے، کان سنتے ہیں مگر ان کے پردے متغیر ہو چکے ہیں، زبان بولتی ہے مگر اس کی گویائی میں فرق آگیا ہے۔ پھیپھڑوں کو صاف ہوا میسر نہیں کہ ایک زہریلی فضا چاروں طرف محیط ہے، معدے کو پاک غذا نہیں ملتی کہ رزق کے خزانے مسموم ہو چکے، عبادات جو اس جسم کے جوارح اور قوائم ہیں قریب قریب ساٹھ فیصدی تو مفلوج ہیں اور چالیس فیصدی جو باقی ہیں وہ بھی کوئی اثر نہیں دکھا رہے ہیں۔ کیونکہ دوسرے اعضائے رئیسہ سے ان کا تعلق باقی نہیں رہا۔ اسی لیے فالج کا مادّہ ان میں پھیلتا جا رہا ہے۔ ایسی حالت میں کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پورا اسلام ہے جو آپ کے سامنے ہے؟ کتنے ہی اعضاء کٹ گئے، کتنے مفلوج ہو گئے، کتنے موجود ہیں، مگر بیمار ہیں اور ٹھیک کام ہی نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک قلب باقی ہے اور وہ خود بیمار ہو رہا ہے کیونکہ جس طرح وہ ان اعضاء کو زندگی کی طاقت بخشتا تھا اسی طرح خود بھی تو ان سے طاقت حاصل کرتا تھا۔ جب دماغ اور پھیپھڑے اور معدہ و جگر سب کا فعل خراب ہو گیا تو قلب کیسے صحیح و سالم رہ سکتا ہے؟ یہ محض اس زبردست قلب کی غیر معمولی طاقت ہے کہ نہ صرف خود زندہ ہے بلکہ بچے کھچے اعضاء کو بھی کسی نہ کسی طرح چلائے جا رہا ہے۔ مگر کیا اس اعضاء بریدہ اسلام میں کوئی کشش ہو سکتی ہے کہ یہ اپنی طرف لوگوں کو کھینچے؟ کیا اس میں یہ طاقت ہے کہ ہندوستان کی زندگی میں اپنا کوئی اثر قائم کر سکے؟ بلکہ خاکم بدہن میں تو یہ پوچھوں گا کہ اس نوبت پر کیا یہ ان حوادث کے مقابلے میں جن کا سیلاب روزافزوں تیزی کے ساتھ آ رہا ہے اپنے بقیہ اعضاء کو مزید قطع و برید سے اور خود اپنے آپ کو موت سے بچا سکتا ہے؟

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کے برعکس اب خود

مسلمانوں کے گروہ میں اسلام سے بغاوت اور انحراف کی وبا پھیل رہی ہے۔ سارے ہندوستان میں اور اس کے اطراف واکناف میں کہیں بھی نظامِ اسلامی اپنی پوری متنبری کے ساتھ کام کرتا ہوا نظر نہیں آتا کہ لوگ اس کے جمال و کمال کو دیکھیں اور درخت کو اس کے پھلوں سے پہچانیں۔ وہ چیز جس کو دیکھتے ہیں وہ یہی اعضاء بریدہ اسلام ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ بس اسلام یہی ہے۔ اس کو دیکھ کر بعض تو علانیہ کہہ رہے ہیں کہ ہم مسلمان نہیں ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو مسلمان ہونے سے بس انکار نہیں کرتے، باقی تمام باتیں ایسی کرتے ہیں کہ ان میں اور منکرینِ اسلام میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ بہت سوں کے دل پھر گئے ہیں مگر چونکہ ابھی صریح بغاوت برپا نہیں ہوئی ہے اس لئے وہ منافقت کے ساتھ مسلمانوں میں شامل ہیں۔ اور بغاوت کے جراثیم پھیلا رہے ہیں تاکہ جب عام بلوہ شروع ہو جائے تب خود بھی اپنا جھنڈا لے کر کھڑے ہوں۔ کچھ لوگ صاف نہیں کہتے مگر دبی زبان سے کہہ رہے ہیں کہ نئی قومیت اور نئی تہذیب میں جذب ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ، کیونکہ یہ تن مُردہ جسے تم لیے بیٹھے ہو، نہ خود تمہیں کوئی فائدہ پہنچا تا ہے اور نہ ان فوائد سے ہی متمتع ہونے دیتا ہے جو دوسروں میں جذب ہونے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک اب مسئلہ کا صحیح حل یہ ہے کہ اسلام کا باضابطہ مثلہ کر ڈالا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ صرف مذہبی عقائد اور مذہبی حرکت وعمل کی حد تک مسلمان رہنا چاہیے باقی زندگی کا سارا پروگرام وہی اختیار کر لینا چاہیے جو غیر مسلموں نے سکھایا ہے اور جس کو غیر مسلم اختیار کر رہے ہیں۔ بہرحال یہ حقیقت ہے جس کو یہ لوگ بھول گئے ہیں یا بھلا رہے ہیں کہ تمام معاملاتِ زندگی میں غیر اسلامی نظریات اختیار کر لینے اور غیر اسلامی اصول پر عامل ہو جانے کے بعد مذہبی عقائد اور مذہبی حرکت وعمل قطعاً بے معنی ہو جاتے ہیں۔

نہ ان پر زیادہ مدت تک ایمان باقی رہ سکتا ہے۔ اور نہ عمل جاری رہ سکتا ہے۔ اس لیئے کہ یہ عقائد اور یہ عبادات تو وہ بنیادیں ہیں جن کو اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ زندگی کی پوری عمارت ان پر تعمیر ہو، جب یہ عمارت دوسری بنیادوں پر تعمیر ہو گئی تو ان آثار قدیمہ سے بے فائدہ و بے ضرورت دلچسپی کب تک باقی رہ سکے گی ؟ نئے نظامِ زندگی میں جو بچہ پرورش پاکر جوان ہوگا وہ پوچھے گا کہ چند لاحاصل عقیدوں اور چند بے نتیجہ رسموں کا یہ قلادہ کیوں میرے گلے میں ڈال رکھا ہے ؟ کیوں اس قرآن کو پڑھوں اور کیوں اس پر ایمان رکھوں، جس کے سارے احکام اب بے کار ہو چکے ہیں ؟ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے جو ایک انسان گزر چکا ہے آج اس کو میں کس لیے خدا کا رسول مانوں جب اس زندگی میں وہ میری رہنمائی نہیں کرتا تو محض اس کی رسالت تسلیم کر لینے سے فائدہ کیا، اور نہ تسلیم کرنے سے نقصان کیا ہے ۔ یہ نظامِ حیات جس پر میں عمل کر رہا ہوں اس میں نماز پڑھنے اور نہ پڑھنے، روزہ رکھنے اور نہ رکھنے سے کیا فرق واقع ہو جاتا ہے ؟ کیا ربط ہے ان اعمال اور اس زندگی کے درمیان ؟ یہ بے جوڑ پیوند میری زندگی میں آخر کیوں لگا رہے ہو ؟۔

یہ منطقی نتیجہ ہے دین اور دنیا کی علیحدگی کا، اور جب یہ علیحدگی اصولاً اور عملاً مکمل ہو جائے گی تو یہ نتیجہ رونما ہو کر رہے گا۔ جس طرح نظامِ جسمانی سے الگ ہو جانے کے بعد قلب بے کار ہو جاتا ہے اسی طرح زندگی سے بے تعلق ہو جانے کے بعد عقائد اور عبادات کی بھی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی ۔ عقائد اور عبادات اسلامی زندگی کو قوتِ حیات دیتے ہیں۔ اور اسلامی زندگی عقائد اور عبادات کو طاقت بہم پہونچاتی ہے، جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں ان دونوں میں ایک زندہ نظامِ جسمانی کے اعضا کا سا تعلق ہے ۔ جسے منقطع کر دینے کا لازمی نتیجہ دونوں کی موت ہے ۔ غیر اسلامی زندگی میں اسلامی

عقائد اور عبادات کا پیوند بالکل ایسا ہی ہوگا، جیسے گوریلا کے جسم میں انسانی دماغ اور انسانی دست وپا۔

یہ نہ سمجھ لیجئے کہ اسلام کی موجودہ حالت کا یہ اثر صرف نئے تعلیم یافتہ طبقے کے ایک مختصر گروہ پر ہی مرتب ہو رہا ہے۔ نہیں آج جو لوگ سچے دل سے مسلمان ہیں، جن کے دلوں میں اس مذہب کی محبت اور عزت موجود ہے خواہ نئے گروہ کے لوگ ہوں یا پرانے گروہ کے، ان سب پر کم وبیش ان حالات کا اثر پڑ رہا ہے۔ اسلامی نظامِ زندگی کا درہم برہم ہو جانا ایک عام مصیبت ہے جس کے طبعی نتائج سے کوئی مسلمان بھی محفوظ نہیں ہے، اور نہ محفوظ رہ سکتا ہے۔ اپنی اپنی استعداد کے مطابق ہم سب کو اس میں سے حصہ مل رہا ہے اور ہمارے علماء ومشائخ بھی اس میں اتنے ہی حصہ دار ہیں جتنے مدرسوں اور کالجوں سے نکلے ہوئے لوگ۔

لیکن سب سے زیادہ خطرے میں ہمارے وہ عوام ہیں جو کروڑوں کی تعداد میں ۱۶ لاکھ مربع میل کے وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس صرف اسلام کا نام باقی ہے، جس سے ان کو غیر معمولی محبت ہے۔ نہ علمی حیثیت سے یہ غریب اس چیز سے واقف ہیں جس پر یہ اس طرح جان دے رہے ہیں اور نہ عملی حیثیت سے کوئی ایسا نظامِ زندگی موجود ہے جو انھیں غیر اسلامی اثرات سے محفوظ رکھ سکے۔ ان کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر ہر گمراہ کرنے والا ان کے عقائد کو اور ان کی زندگی کو اسلام کی صراطِ مستقیم سے ہٹا سکتا ہے۔ بس انھیں یہ اطمینان دلا دینا کافی ہے کہ یہ ضلالت جو ان کے سامنے پیش کی جا رہی ہے یہی عین ہدایت ہے، یا کم از کم اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ اس کے بعد آپ جس راستے پر چاہیں انھیں بھٹکا لے جا سکتے ہیں۔ خواہ وہ قادیانیت کا

راستہ ہو یا اشتراکیت کا یا فسطائیت کا ان کے روز افزوں افلاس اور ان کی ہولناک معاشی خستہ حالی نے جو مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کو موجودہ بے نظمی کی حالت میں اصولِ اسلام کے مطابق حل کرنے کی کوشش نہیں ہو رہی ہے۔ مسلمانوں میں منظم جماعت ایسی موجود نہیں جو اشتراکیت کے مقابلے میں اسلام کے معاشی و تمدنی اصولوں کو لے کر اُٹھے اور ان مسائل کو حل کر کے دکھا دے جو عام لوگوں کے لیے فی الواقع بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کروڑوں مفلس و فاقہ کش مسلمانوں کی یہ بھیڑ اشتراکی مبلغین کے لیے نہایت سہل الحصول شکار بن گئی ہے۔ بورژوا طبقے کے جن لوگوں میں حوصلہ مندی اور اقتدار کی حرص ذرا اعتدال سے بڑھی ہوئی ہے وہ ہمیشہ سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لیے نئی نئی تدبیریں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اب روسی انقلاب نے اس طبقے کے ایک گروہ کو ایک اور تدبیر سکھا دی ہے اور وہ یہ ہے کہ کسان اور مزدور کے حامی بن کر غریب عوام کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ ان کے اندر خود غرضی حرص اور حسد کی آگ بھڑکائیں۔ ان کے جائز حقوق سے بڑھ کر انھیں دولت میں حصہ دلوانے کا لالچ دلائیں، خوش حال طبقوں کی جائز دولت تک چھین کر ان میں تقسیم کر دینے کا وعدہ کریں۔ اور اس طرح ملک کے سوادِ اعظم کو اپنی مٹھی میں لے کر وہ اقتدار حاصل کریں جو سرمایہ داری نظام کے بادشاہوں، ڈکٹیٹروں اور کروڑپتیوں کو حاصل ہے۔ یہ لوگ غیر مسلم عوام سے بڑھ کر مسلم عوام سے توقعات رکھتے ہیں۔ کیونکہ معاشی حیثیت سے مسلمان زیادہ خستہ حال ہیں یہ ان کے دلوں پر قبضہ کرنے کے لیے پیٹ کی طرف سے راستہ پیدا کر رہے ہیں، جو بھوکے آدمی کے جسم کا سب سے زیادہ نازک حصہ ہوتا ہے۔ یہ ان سے کہتے ہیں کہ "آؤ ہم وہ طریقہ بتائیں جس سے امیری اور غریبی مرتی ہے اور آسودہ حالی آتی ہے"۔ پھر جب بے چارہ بھوکا مسلمان دو روٹیوں کی امید پر ان کی طرف دوڑتا ہے تو یہ اسے خدا پرستی کے بجائے شکم پرستی

کے مذہب کی تلقین کرتے ہیں اور یہ جذبہ اس کے دل میں پیدا کرتے ہیں کہ دین اور ایمان کوئی چیز نہیں، اصل روٹی ہے، وہ جس طریقے سے ملے وہی دین ہے اور اسی میں نجات ہے۔

"غریب مفلس اور غلام کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں، اس کا سب سے بڑا مذہب روٹی کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس کا سب سے بڑا تمدن ایک پھٹا پرانا کرتا ہے اس کا سب سے بڑا ایمان اس موجودہ افلاس اور نکبت سے چھٹکارا پا لینا ہے، وہی روٹی اور کپڑا جس کے لیے وہ چوری تک کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے آج افلاس اور غلامی کی دنیا میں اس کا کوئی مذہب نہیں۔"

یہ ابتدائی سبق ہے مذہب اشتراکیت کا اور جس آن یہ سبق بے چارے جاہل و مفلس مسلمان کو دیا جاتا ہے اسی آن انھیں اس امر کا اطمینان بھی دلایا جاتا ہے کہ ہم تمہارے مذہب کو ہاتھ نہیں لگاتے۔

"مذہب اور عقائد کو ان باتوں سے کیا خطرہ؟ کیا تعلق؟ مذہب تو ہمیشہ اگر اس میں اخلاقی اور روحانی طاقت رہی ہے، تو زندہ تابندہ اور پائندہ ہی رہا ہے۔"[1]

گذشتہ بیس سال کے اندر روسی اشتراکیت کے جو اثرات مسلمانان روس کی نوخیز نسلوں پر مرتب ہوئے ہیں وہ جاننے والوں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ یہی مستقبل مسلمانانِ ہند کے سامنے بھی دھمکیاں دیتا ہوا آ رہا ہے۔ پیٹ کی آگ متاعِ ایمان کو خاکستر کر دینے

---

[1] یہ دونوں فقرے جو یہاں نقل کیے گئے ہیں ایک مسلمان صاحب کے مضمون سے ماخوذ ہیں جو ایک کثیر الاشاعت مسلم اخبار کے کالموں میں شائع ہوا ہے۔

کے لیے بڑھ رہی ہے۔ ابھی تک یہ سرچشمہ اتنا چھوٹا ہے کہ اسے ایک سلائی سے بند کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر غفلت کے چند سال یوں ہی گزار دیئے گئے تو یہ اتنا بڑا سیلاب بن جائیگا کہ اس کے مقابلے میں ہاتھیوں کے پاؤں اُکھڑ جائیں گے۔

ان حالات میں محض عیسائی مشنریوں کے ڈھنگ پر اسلام کی تبلیغ کر دینا لاحاصل ہے۔ عقائد کی اصلاح کے لیے ایک رسالہ نہیں ہزاروں رسالے اگر لاکھوں کی تعداد میں بھی شائع کر دیئے جائیں تو یہ حالات روبراہ نہیں آسکتے۔ محض زبان اور قلم سے اسلام کی خوبیوں کو بیان کر دینے سے کیا فائدہ؟ ضرورت تو اس کی ہے کہ ان خوبیوں کو واقعات کی دنیا میں سامنے لایا جائے۔ محض یہ کہہ دینے سے کہ اسلام کے اصولوں میں زندگی کے مسائل کا حل موجود ہے، سارے مسائل خود بخود حل نہیں ہو جائیں گے۔ اسلام میں بالقوۃ جو کچھ موجود ہے۔ اس کو بالفعل بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ دنیا کشمکش اور جدوجہد کی دنیا ہے۔ اس کی رفتار محض باتوں سے نہیں بدلی جا سکتی۔ اس کو بدلنے کے لیے انقلاب انگیز جہاد کی ضرورت ہے۔ اگر اشتراکی اپنے غلط اصولوں کو لے کر نصف صدی کے اندر دنیا کے ایک بڑے حصے میں اپنا اثر و اقتدار قائم کر سکتے ہیں۔ اگر فاشیت اپنے غیر معتدل طریقوں کو لیکر دنیا پر اپنی دھاک بٹھا سکتی ہے۔ اگر گاندھی کی اہنسا ایک غیر فطری چیز ہونے کے باوجود محض جدوجہد کے بل پر فروغ پا سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان جن کے پاس حق اور عدل کے غیر فانی اصول ہیں۔ ایک مرتبہ پھر دنیا میں اپنا سکہ نہ جما سکیں۔ مگر یہ سکہ نرے وعظ و تلقین سے نہیں جم سکتا اس کے لیے سعی و عمل کی ضرورت ہے اور انہی طریقوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے جن سے سنت اللہ کے مطابق دنیا میں سکہ جما کرتا ہے۔

انقلاب انگیز جدوجہد" ایک مبہم لفظ ہے اس کی عملی صورتیں بہت سی ہیں،

اور بہت سی ہو سکتی ہیں۔ جس قسم کا انقلاب برپا کرنا مقصود ہو اس کے لیے وہی صورت اختیار کرنی پڑے گی جو اس انقلاب کی فطرت سے مناسبت رکھتی ہو۔

ہم جو انقلاب چاہتے ہیں اس کے لیے ہمیں کوئی نئی صورت تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ انقلاب اس سے پہلے برپا ہو چکا ہے۔ جس پاک انسان نے (صلی اللہ علیہ وسلم) پہلی مرتبہ انقلاب برپا کیا تھا وہی اس کی فطرت کو خوب جانتا تھا اور اسی کے اختیار کیے ہوئے طریقے کی پیروی کر کے آج بھی یہ انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ اس پاک ہستی کی سیرت ایک لحاظ سے معجزہ ہے، مگر دوسرے لحاظ سے اسوہ بھی ہے، وہ اخلاق وہ تقویٰ، وہ حکمت، وہ عدالت، وہ طاقت اور شخصیت وہ انسانیت کبریٰ کی عظیم الشان خصوصیات اب کوئی انسان کہاں سے لا سکتا ہے؟۔ اس لیے اب کوئی انسان اتنا کمال درجے کا انقلاب بھی کہاں برپا کر سکتا ہے؟ اس لحاظ سے وہ معجزہ ہے اور قیامت تک کے لیے معجزہ ہے۔ لیکن اس انسانِ اکبر نے جو نمونہ چھوڑا ہے اس کا طبعی خاصہ وہی انقلاب انگیزی ہے جس کی نظیر ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دنیا کے سامنے آ چکی ہے۔ اس نمونے کی جتنی زیادہ پیروی کی جائے گی اور جس قدر زیادہ اس سے مماثلت پیدا کی جائے گی اسی قدر زیادہ انقلاب انگیز نتائج بھی ظاہر ہوں گے اور وہ اس پہلے انقلاب سے اتنی ہی زیادہ اقرب ہوں گے جو اصل نمونے کی طاقت سے برپا ہوا تھا۔ اس لحاظ سے وہ اسوہ ہے اور قیامت تک کے لیے اُسوہ ہے۔ بیسویں صدی ہو یا چالیسویں صدی ہندوستان ہو یا امریکہ یا روس، جہاں اور جس وقت چاہیں آپ اسی نوعیت کا انقلاب برپا کر سکتے ہیں بشرطیکہ اسی اُسوۂ حسنہ کو سامنے رکھ کر کام کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریقے سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کی

دنیا میں انقلاب برپا کیا تھا اس کی تفصیلات یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں۔ یہاں صرف اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ادارہ "دارالاسلام" کا تخیل اسی اسوۂ پاک کے غائر مطالعے سے پیدا ہوا ہے۔

آنحضرتؐ جب مبعوث ہوئے تو روئے زمین پر ایک شخص بھی مسلم نہ تھا آپؐ نے اپنی دعوت دنیا کے سامنے پیش کی اور آہستہ آہستہ متفرق طور پر ایک ایک دو دو چار چار آدمی مسلمان ہوتے چلے گئے۔ یہ لوگ اگرچہ پہاڑ سے زیادہ مضبوط ایمان رکھتے تھے اور ایسی فدویت ان کو اسلام کے ساتھ تھی کہ دنیا ان کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، مگر چونکہ متفرق تھے، کفار کے درمیان گھرے ہوئے تھے، بے بس اور کمزور تھے اس لیے اپنے ماحول سے لڑتے لڑتے ان کے بازو شل ہو جاتے تھے اور پھر بھی وہ ان حالات کو نہ بدل سکتے تھے جن کو بدلنے کے لیے وہ اور ان کے ہادی و مرشد فداہٗ امی وابی کوشش فرما رہے تھے۔ تیرہ سال تک حضورؐ اس طرح جدوجہد کرتے رہے اور اس مدت میں سرفروش اہلِ ایمان کی ایک مٹھی بھر جماعت آپؐ نے فراہم کر لی۔ اس کے بعد اللہ نے دوسری تدبیر کی طرف آپؐ کی ہدایت فرمائی۔ اور وہ یہ تھی کہ ان سرفروشوں کو لے کر کفر کے ماحول سے نکل جائیں۔ ایک جگہ ان کو جمع کر کے اسلامی ماحول پیدا کریں۔ اسلام کا ایک گھر بنائیں جہاں اسلامی زندگی کا پورا پورا پروگرام نافذ ہو۔ ایک مرکز بنائیں جہاں مسلمانوں میں اجتماعی طاقت پیدا ہو۔ ایک ایسا پاور ہاؤس بنا دیں جس میں تمام برقی طاقت جمع ہو جائے اور پھر ایک منضبط طریقے سے وہ پھیلنی شروع ہو یہاں تک کہ زمین کا گوشہ گوشہ اس سے منور ہو جائے۔ مدینہ طیبہ کی جانب آپؐ کی ہجرت اسی غرض کے لیے تھی۔ تمام مسلمان جو عرب کے مختلف قبیلوں میں منتشر تھے ان سب کو حکم دیا گیا کہ

سمٹ کر اس مرکز پر جمع ہو جائیں۔ یہاں اسلام کو عمل کی صورت میں نافذ کر کے بتایا گیا۔ اس پاک ماحول میں پوری جماعت کو اسلامی زندگی کی ایسی تربیت دی گئی کہ اس جماعت کا ہر شخص ایک چلتا پھرتا اسلام بن گیا جسے دیکھ لینا ہی یہ معلوم کرنے کے لیے کافی تھا کہ اسلام کیا ہے اور کس لیے آیا ہے۔ ان پر اللہ کا رنگ (صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً)[1] اتنا گہرا چڑھایا گیا کہ وہ جدھر جائیں دوسروں کا رنگ قبول کرنے کے بجائے اپنا رنگ دوسروں پر چڑھا دیں۔ ان میں کیرکٹر کی اتنی طاقت پیدا کی گئی کہ وہ کسی سے مغلوب نہ ہوں۔ اور جو ان کے مقابلے میں آئے ان سے مغلوب ہو کر رہ جائے۔ ان کی رگ رگ میں اسلامی زندگی کا نصب العین اس طرح پیوست کر دیا گیا کہ زندگی کے ہر عمل میں وہ مقدم ہو اور باقی تمام دنیوی اغراض ثانوی درجہ میں ہوں۔ ان کو تعلیم اور تربیت دونوں کے ذریعے سے اس قابل بنا دیا گیا کہ جہاں جائیں زندگی کے اسی پروگرام کو نافذ کر کے چھوڑیں جو قرآن و سنت نے انھیں دیا ہے۔ اور ہر قسم کے بگڑے ہوئے حالات کو منقلب کر کے اسی کے مطابق ڈھال لیں۔

یہ حیرت انگیز تنظیم تھی جس کا ایک ایک جز گہرے مطالعے اور غور و فکر کا مستحق ہے اس تنظیم میں کام کو چار بڑے بڑے شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

۱۔ ایک گروہ ایسے لوگوں کا تیار کیا جائے جو دین میں تفقہ حاصل کریں جن میں یہ استعداد ہو کہ لوگوں کو دین اور اس کے احکام بہترین طریقے پر سمجھا سکیں۔ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا

---

[1] اللہ کا رنگ اختیار کرو، اس کے رنگ سے اچھا کس کا رنگ ہوگا۔

رَجَعُوٓا اِلَيْهِمْ[1] (التوبہ ۱۵)۔

۲۔ کچھ لوگ ایسے تیار کئے جائیں جن کی زندگیاں اسلام کے نظام العمل کو قائم کرنے اور پھیلانے کی سعی وجہد کے لیے وقف ہوں۔ جماعت کا فرض ہے کہ ان کو کسبِ معیشت سے بے نیاز کر دیں لیکن خود انھیں اس کی پرواہ نہ ہو۔ چاہے معیشت کا کوئی انتظام ہو یا نہ ہو، بہر حال وہ اپنے دل کی لگن سے مجبور ہوں اور ہر قسم کی مصیبتیں برداشت کر کے اس کام میں لگے رہیں جو ان کی زندگی کا واحد نصب العین ہے۔
وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ[2] (آلِ عمران۔ ۱۱)

۳۔ پوری جماعت میں یہ جذبہ پیدا کیا جائے کہ ہر شخص اعلاء کلمۃ اللہ کو اپنی زندگی کا اصل مقصد سمجھے۔ وہ اپنے دنیا کے کاروبار چلاتا رہے مگر ہر کام میں یہ مقصد اس کے سامنے ہو۔ تاجر اپنی تجارت میں، کسان اپنی زراعت میں، صنّاع اپنے پیشے کے کام میں اور ملازم اپنی ملازمت میں اس مقصد کو کبھی نہ بھولے۔ وہ ہمیشہ اس بات کو پیشِ نظر رکھے کہ یہ سب کام جینے کے لیے ہیں اور جینا اس ایک کام کے لیے ہے وہ زندگی کے جس دائرے میں بھی کام کرے اپنے اقوال و افعال اور اپنے اخلاق اور معاملات میں اسلام کے اصول کی

---

[1] کیوں نہ ایسا کیا گیا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکل آتی ہوتی کہ دین میں دانش و فہم پیدا کرے اور جب اپنے گروہ میں واپس جاتی تو لوگوں کو جہل و غفلت کے نتائج سے ہشیار کرتی۔

[2] ضروری ہے کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہو جو بھلائی کی باتوں کی طرف دعوت دینے والی ہو۔ وہ نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔

پابندی کرے۔ اور جہاں دنیوی فوائد میں اور اصولِ اسلام میں تناقض واقع ہو جائے وہاں بر ملا ٹھکرا دے اور اصول ہاتھ سے دے کر اسلام کی عزت کو بٹہ نہ لگائے۔ پھر وہ جتنا مال اور جتنا وقت اپنی ذاتی ضروریات سے بچا سکتا ہو۔ اس کو اسلام کی خدمت میں صرف کر دے اور ان لوگوں کا ہاتھ بٹائے جنہوں نے اپنی زندگیاں اس کام کے لیے وقف کی ہیں۔ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ؕ[1] (آل عمران ۱۲)

۴۔ باہر کے لوگوں کو موقع دیا جائے کہ دارالاسلام میں آئیں اور اس ماحول میں رہ کر کلام اللہ کا مطالعہ کریں جہاں کی ساری زندگی اس کلام پاک کی عملی تفسیر ہے۔ کفر کے ماحول کی بہ نسبت اسلام کے ماحول میں وہ قرآن کو زیادہ بہتر سمجھیں گے اور زیادہ گہرا اثر لے کر واپس جائیں گے۔ وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ؕ[2] (التوبہ ۱)

اس طرح صرف آٹھ برس کی قلیل مدت میں دنیا میں اس سب سے بڑے ہادی و رہبر نے مدینہ کے پاور ہاؤس میں اتنی زبردست طاقت بھر دی کہ اس نے دیکھتے دیکھتے سارے عرب کو منور کر دیا اور پھر عرب سے نکل کر اس کی روشنی روئے زمین پر پھیل

---

[1] تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کی (ہدایت) کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے اور اللہ پر ایمان رکھنے والے ہو۔

[2] اگر کوئی مشرک تم سے امان مانگے تو اسے ضرور امان دو، یہاں تک کہ وہ کلام اللہ کا کلام سن لے پھر اسے اس کے ٹھکانے پہنچا دو۔

گئی حتیٰ کہ آج ساڑھے تیرہ سو برس گزر چکے ہیں مگر وہ پاور ہاؤس اب بھی طاقت کے خزانوں سے بھرا ہوا ہے۔

خلافتِ راشدہ کے بعد جب نظامِ اسلامی میں بہت کچھ برہمی پیدا ہو گئی، تو صوفیائے اسلام نے بھی اسی طریقے کی پیروی کی، اور جگہ جگہ خانقاہیں قائم کیں۔ آج خانقاہ کا مفہوم اس قدر گر گیا ہے کہ یہ لفظ سنتے ہی انسان کے ذہن میں ایک ایسی جگہ کا تصور آجاتا ہے جہاں ہوا اور روشنی کا گزر نہ ہوا ور صدیوں تک جنتری کا ورق نہ پلٹے مگر اصل میں یہ خانقاہ بھی اسی نمونے کی ایک نقل تھی جسے سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں قائم کیا تھا۔ صوفیائے کرام جن لوگوں میں اچھی استعداد پاتے تھے ان کو بیرونی دنیا کے گندے ماحول سے نکال کر کچھ مدت تک خانقاہ میں رکھتے تھے۔ اور وہاں اعلیٰ درجہ کی تربیت دے کر انھیں اسی کام کے لیے تیار کرتے تھے جس کے لیے مرشدِ اعظمؐ اپنے صحابہؓ کو تیار کرتے تھے۔

اب جو لوگ اسلامی طرز کا انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں ان کو پھر اسی طریقے کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ اگر ہم ہندوستان سے نکل کر کہیں ایسی آزاد فضا نہیں پا سکتے جہاں مدینہ طیبہ کی طرح "دارالاسلام" بنایا جا سکے تو کم از کم ہم کو اسی ملک میں ایسی تربیت گاہیں بنانی چاہئیں جہاں خالص اسلامی ماحول پیدا کیا جائے، جہاں اخلاق اسلامی ہوں، معاشرت اسلامی ہو، عملی زندگی مسلمانوں کی سی ہو، گرد و پیش ہر طرف اسلام اپنی روح اور اپنی صورت کے ساتھ نمایاں ہو، جہاں کسی چیز کے صحیح ہونے کے لیے صرف یہ دلیل کافی ہو کہ خدا اور رسولؐ نے اس کی اجازت دی ہے یا اس کا حکم دیا ہے، اور کسی چیز کا غلط ہونا صرف اس دلیل سے تسلیم کیا جائے کہ خدا اور رسول نے اس سے منع کیا ہے یا اسے ناپسند کیا ہے

جہاں یہ بغاوت اور سرکشی کا ماحول اور غیر اسلامی فضا نہ ہو جس نے ہر طرف سے ہمارا احاطہ کر رکھا ہے جہاں ہم کو کم از کم اتنا اختیار تو ہو کہ بیرونی اثرات میں سے جن کو ہم روحِ اسلامی کے موافق پائیں، صرف انھیں کو داخل ہونے دیں اور جن کو منافی پائیں ان کو اپنی زندگی پر مسلّط ہونے اور اپنے دماغ میں نفوذ کرنے سے روک سکیں، جہاں ہم کو ایسی فضا میسّر آسکے کہ مسلمان کی طرح سوچ سکیں، مسلمان کی سی نظر اپنے اندر پیدا کر سکیں، ان اسلامی صفات کو نشو و نما دے سکیں جو اس دارالکفر کی مسموم آب و ہوا میں فنا ہوتی چلی جارہی ہیں۔ ان گندگیوں اور آلائشوں سے اپنی زندگی کو پاک کر سکیں جو غیر اسلامی ماحول میں آنکھیں کھولنے اور نشو و نما پانے کی وجہ سے ہمارے افکار اور اعمال میں گھس گئی ہیں۔ جن کا شعور تک بسا اوقات ہمیں نہیں ہوتا، اور جن کو اگر ہم محسوس بھی کر لیتے ہیں تو ماحول کی طاقت اتنی جابر و قاہر ثابت ہوتی ہے کہ باوجود کوشش کرنے کے ہم اپنے آپ کو ان سے نہیں بچا سکتے۔

اس قسم کی تربیت گاہوں میں ایسے لوگوں کو جمع کیا جائے جو سچے دل سے اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہوں اور وہاں ان کو صحیح تعلیم و تربیت دے کر اس خدمت کے لیے تیار کیا جائے وہاں کے کام کا نقشہ وہی ہو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کا نقشہ تھا۔ اسی طرح کام کو چار شعبوں پر تقسیم کیا جائے اور اسی طرح ہر شعبے میں آدمیت کو اسلامیت کے سانچے میں ڈھالنے کی تدبیر کی جائے۔

۱۔ ایک ایسا شعبہ ہو کہ جس میں اعلیٰ درجے کی علمی استعداد کے لوگ شامل ہوں۔ ان میں سے جو لوگ علومِ دینیہ میں دستگاہ رکھتے ہوں انھیں مغربی زبانوں اور علومِ جدیدہ سے روشناس کیا جائے، اور جن حضرات نے علومِ جدیدہ کی تحصیل کی ہو انھیں عربی زبان اور اسلامی علوم کی تعلیم دی جائے، پھر یہ لوگ قرآن اور سنّت کا گہرا مطالعہ کر کے دین میں تفقہ اور بصیرت حاصل کریں اس کے بعد ان کے مختلف گروپ

بنا دیئے جائیں۔ ہر گروپ ایک ایک شعبۂ علوم کو لے کر اس میں اسلام کے اصول و نظریات کو جدید طرز پر مرتب کرے، زندگی کے جدید مسائل کو سمجھے اور اصولِ اسلام کے مطابق ان کا حل تلاش کرے۔ علوم کی بنیاد میں جو مغربی نقطۂ نظر پیوست ہو گیا ہے اس کو نکال کر اسلام کے نقطۂ نظر سے علوم کو از سرِ نو مدوّن کرے اور اپنی تحقیقات سے ایسا صالح لٹریچر پیدا کرے جو اسلام کی موافقت میں ایک انقلاب برپا کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔

۲۔ دوسرا شعبہ ایسا ہو جس میں خدمتِ اسلام کے لیے اچھے کارکن تیار کرنے کی کوشش کی جائے، پاکیزہ اخلاق، مضبوط سیرت، دُھن کے پکّے اور اپنے نصب العین کے لیے سب کچھ قربان کر دینے والے لوگ جو ایک زبردست انقلابی پارٹی کی صورت میں منظم ہوں جن کی زندگی سادہ ہو، جن میں جفاکشی ہو، جن میں پورا ضبط و نظم پایا جائے اور جن کی عملی سیرت ٹھیٹھ مسلمان کی سی ہو یہ پارٹی اسلام کے اصولوں پر ایک نئے اجتماعی نظام (SOCIAL ORDER) اور ایک نئی تہذیب (CIVILIZATION) کی تعمیر کا پروگرام لے کر اُٹھے اور عامۂ خلائق کے سامنے اپنے پروگرام کو پیش کر کے زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت فراہم کرے اور بالآخر حکومت کی مشین پر قابض ہو جائے تاکہ ظلم و جور کی حکومت کو عدل کی حکومت میں تبدیل کیا جائے۔

۳۔ تیسرے شعبے میں ایسے لوگ ہوں جو صرف تھوڑی مدت کے لیے تربیت گاہ میں رہ کر واپس جانا چاہتے ہوں انھیں صحیح علم اور اخلاقی تربیت دے کر چھوڑ دیا جائے کہ جہاں چاہیں رہیں مگر مسلمان کی طرح رہیں دوسروں سے متاثر ہونے کے بجائے ان پر اپنا اثر ڈالیں۔ اپنے اصولوں میں سخت ہوں، اپنے عقائد میں مضبوط ہوں بے مقصد زندگی نہ بسر کریں، ایک نصب العین ہر حال میں ان کے سامنے ہو، پاک طریقوں سے روزی کمائیں اور ان لوگوں کو

ہر ممکن طریقے سے مدد دینے کے لیے تیار رہیں جو شعبہ نمبر ۲ کے تحت کام کر رہے ہوں۔ یہ ان کو مالی مدد بھی دیں، ان کے کاموں میں عملاً بھی شریک ہوں اور جہاں رہیں وہاں کی فضا کو انقلابی پارٹی کی موافقت میں تیار بھی کرتے رہیں۔

۴۔ چوتھا شعبہ ایسے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے ہو جو محض عارضی طور پر تربیت گاہ میں آکر کچھ عملی استفادہ کرنا چاہیں یا وہاں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے خواہش مند ہوں، ان لوگوں کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہونچائی جائیں تاکہ وہ اسلام اور اس کی تعلیم کا گہرا نقش لے کر واپس جائیں۔

یہ ایک سرسری سا خاکہ ہے۔ اس نظام کا جو ہمارے نزدیک اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے ایک ضروری مقدمے کی حیثیت رکھتا ہے اس نظام کی کامیابی کا انحصار تمام تر اس پر ہے کہ یہ اپنی روح اور اپنے جوہر میں مدینہ طیبہ کے اس مثالی نظام کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مماثلت پیدا کرے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا۔

مدینہ طیبہ سے مماثلت پیدا کرنے کا مفہوم کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم ظاہری اشکال میں مماثلت پیدا کرنا چاہتے ہیں اور دنیا اس وقت تمدن کے جس مرتبہ پر ہے اس سے رجعت کر کے اس تمدنی مرتبہ پر واپس جانے کے خواہش مند ہیں، جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا۔ اتباع رسولؐ کا یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے اور اکثر دیندار لوگ غلطی سے اس کا یہی مفہوم لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک سلف صالح کی پیروی اس کا نام ہے۔ کہ جیسا لباس وہ پہنتے تھے ویسا ہی ہم پہنیں۔ جس قسم کے کھانے وہ کھاتے تھے اسی قسم کے کھانے ہم بھی کھائیں۔ جیسا طرزِ معاشرت ان کے گھروں میں تھا وہی طرزِ معاشرت ہمارے گھروں میں بھی ہو، تمدن و حضارت کی جو حالت ان کے عہد میں

تھی اس کو ہم بالکل متحجر (FOSSILISED) صورت میں قیامت تک باقی رکھنے کی کوشش کریں اور ہمارے اس ماحول سے باہر کی دنیا میں جو تغیرات واقع ہو رہے ہیں ان سب سے آنکھیں بند کر کے ہم اپنے دماغ اور اپنی زندگی کے ارد گرد ایک حصار کھینچ لیں جس کی سرحد میں وقت کی حرکت اور زمانے کے تغیر کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہو۔

اتباع کا یہ تصور جو دورِ انحطاط کی کئی صدیوں سے دین دار مسلمانوں کے دماغوں پر مسلط رہا ہے، درحقیقت روحِ اسلام کے بالکل منافی ہے اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ جیتے جاگتے آثارِ قدیمہ بن کر رہیں اور اپنی زندگی کو قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈرامہ بنائے رکھیں۔ وہ ہمیں رہبانیت اور قدامت پرستی نہیں سکھاتا اس کا مقصد دنیا میں ایک ایسی قوم پیدا کرنا نہیں ہے جو تغیر و ارتقاء کو روکنے کی کوشش کرتی رہے بلکہ اس کے بالکل برعکس وہ ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہے جو تغیر و ارتقاء کو غلط راستوں سے پھیر کر صحیح راستوں پر چلانے کی کوشش کرے وہ ہم کو قالب نہیں دیتا بلکہ روح دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں ان سب میں یہی روح بھرتے چلے جائیں۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا اصلی مشن یہی ہے ہم کو "خَیْرَ اُمَّۃٍ" جو بنایا گیا ہے تو اس لیے نہیں کہ ہم ارتقاء کے راستے میں آگے بڑھنے والوں کے پیچھے عقب لشکر (REARGUARD) کی حیثیت میں لگے رہیں بلکہ ہمارا کام امامت و رہنمائی ہے۔ ہم مقدمۃ الجیش بننے کے لیے پیدا کئے گئے ہیں اور ہمارے خَیْرَ اُمَّۃٍ ہونے کا راز اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ میں پوشیدہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا اصلی اسوہ جس کی پیروی ہمیں کرنی چاہیے۔ یہ ہے کہ انھوں نے قوانینِ طبیعی کو قوانینِ شرعی کے تحت استعمال کر کے زمین میں خدا کی خلافت کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ ان کے عہد میں جو تمدن تھا انھوں نے اس کے قالب میں اسلامی تہذیب

کی رُوح پھونکی اس وقت جتنی طبعی قوتوں پر انسان کو دسترس حاصل ہو چکی تھی ان سب کو انھوں نے اس تہذیب کا خادم بنایا اور غلبہ و ترقی کے جس قدر وسائل تمدن نے فراہم کیے تھے ان سے کام لینے میں وہ کفار اور مشرکین سے سبقت لے گئے تاکہ خدا سے بغاوت کرنے والوں کی تہذیب کے مقابلے میں خدا کی خلافت سنبھالنے والوں کی تہذیب کامیاب ہو۔ اسی چیز کی تعلیم خدا نے اپنی کتاب میں ان کو دی تھی کہ اَعِدُّوْا لَھُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّۃٍ ان کو سکھایا گیا تھا کہ خدا کی پیدا کی ہوئی قوتوں سے کام لینے کا حق کافر سے زیادہ مسلم کو پہنچتا ہے بلکہ اس کا اصلی حق دار مسلم ہی ہے۔ پس نبیؐ و اصحاب نبیؐ کا صحیح اتباع یہ ہے کہ تمدن کے ارتقاء اور قوانین طبعی کے اکتشافات سے اب جو وسائل پیدا ہوئے ہیں ان کو ہم اسی طرح تہذیب اسلامی کا خادم بنانے کی کوشش کریں جس طرح صدرِ اوّل میں کی گئی تھی نجاست اور گندگی جو کچھ ہے وہ ان وسائل میں نہیں ہے بلکہ اس کافرانہ تہذیب میں ہے جو ان وسائل سے فروغ پا رہی ہے۔ ریڈیو بجائے خود ناپاک نہیں ہے ناپاک وہ تہذیب ہے جو ریڈیو کے ڈائرکٹر کو داروغۂ ارباب نشاط یا ناشر کذب و افترا بناتی ہے۔ ہوائی جہاز ناپاک نہیں ہے ناپاک وہ تہذیب ہے جو ہوا کے فرشتے سے خدائی قانون کے بجائے شیطانی اغوا کے تحت خدمت لیتی ہے، سینما ناپاک نہیں ہے ناپاک دراصل وہ تہذیب ہے جو خدا کی پیدا کی ہوئی اس طاقت سے فحش اور بے حیائی کی اشاعت کا کام لیتی ہے۔ اور اس ناپاک تہذیب کو فروغ اسی لیے ہو رہا ہے کہ اس کو فروغ دینے کے لیے خدا کی بخشی ہوئی تمام ان طاقتوں سے کام لیا جارہا ہے جو اس وقت انسان پر منکشف ہوئی ہیں۔ اب اگر ہم اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں جو الٰہی تہذیب کو فروغ دینے کے لیے ہم پر عائد ہوتا ہے تو ہمیں بھی انہی طاقتوں سے کام لینا چاہیے یہ طاقتیں تو تلوار کی طرح ہیں کہ جو اس سے کام لے گا وہی کامیاب

ہوگا خواہ وہ ناپاک مقصد کے لیے کام لے یا پاک مقصد کے لیے۔ پاک مقصد والا اگر اپنے مقصد کی پاکی ہی کو لیے بیٹھا رہے اور تلوار استعمال نہ کرے تو یہ اس کا قصور ہے اور اس قصور کی سزا اسے بھگتنی پڑے گی۔ کیونکہ اس عالمِ اسباب میں خدا کی جو سنّت ہے اسے کسی کی خاطر نہیں بدلا جا سکتا۔

اس تصریح سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تحریک جسے میں پیش کر رہا ہوں نہ تو کوئی ارتجاعی (REACTIONARY) تحریک ہے اور نہ اس قسم کی ارتقائی تحریک ہے جس کے پیشِ نظر صرف مادی ارتقاء ہو۔ میرے پیشِ نظر جو تربیت گاہ ہے اس کے لیے گروکل کانگڑی، ستیہ گرہ آشرم، شانتی نکیتن اور دیال باغ میں کوئی نمونہ نہیں ہے۔ اور اسی طرح جس انقلابی پارٹی کا تصور میرے ذہن میں ہے اس کے لیے اٹلی کی فاشسٹ اور جرمنی کی نیشنل سوشلسٹ پارٹی میں بھی کوئی نمونہ نہیں ہے اس کے لیے اگر کوئی نمونہ ہے تو وہ صرف مدینۃ الرسول اور حزب اللہ میں ہے جسے نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب کیا تھا۔

(ترجمان القرآن شوال ۱۳۵۶ھ، دسمبر ۱۹۳۷ء)

اسلام
کا
اخلاقی نقطۂ نظر

کزی مکتبۂ اسلامی دہلی ۶

مطبوعات اشاعتِ اسلام ٹرسٹ ۔ ۱۳۲

اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

مارچ ۱۹۷۴ء ـــــ ۲۰۰۰

قیمت ـــ ۰۔ ۵

Rs 0 - P 7 5

مطبوعہ:۔

جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر

معمولی حالات میں، جب کہ زندگی کا دریا سکون کے ساتھ بہہ رہا ہو، انسان ایک طرح کا اطمینان محسوس کرتا ہے، کیونکہ اوپر کی صاف شفاف سطح ایک پردہ بن جاتی ہے جس کے نیچے تہ میں بیٹھی ہوئی گندگیاں اور غلاظتیں چھپی رہتی ہیں اور پردے کی اوپری صفائی آدمی کو اس بات کا تجسس کرنے کی ضرورت کم ہی محسوس ہونے دیتی ہے کہ تہ میں کیا کچھ چھپا ہوا ہے اور کیوں چھپا ہوا ہے۔ لیکن جب اس دریا میں طوفان برپا ہوتا ہے اور نیچے کی چھپی ہوئی ساری گندگیاں اور غلاظتیں ابھر کر برسرِ عام سطحِ دریا پر بہنے لگتی ہیں اس وقت اندھوں کے سوا ہر وہ شخص جس کے دیدوں میں کچھ بھی بینائی کا نور باقی ہے، ہر اشتباہ کے بغیر صاف صاف دیکھ لیتا ہے کہ زندگی کا دریا یہ کچھ اپنے اندر لیے ہوئے چل رہا ہے،

اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب عام انسانوں میں اس ضرورت کا احساس پیدا ہو سکتا ہے کہ اس منبع کا سراغ لگائیں جہاں سے دریائے زندگی میں یہ گندگیاں آرہی ہیں اور اس تدبیر کی جستجو کریں جس سے اس دریا کو پاک کیا اور رکھا جا سکے۔ فی الواقع اگر ایسے وقت میں بھی لوگوں کے اندر اس ضرورت کا احساس بیدار نہ ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ نوعِ انسانی اپنی غفلت کے نشے میں مدہوش ہو کر سود و زیاں سے بالکل ہی بے فکر ہو چکی ہے۔

یہ زمانہ جس سے ہم آج کل گذر رہے ہیں انہی غیر معمولی حالات کا زمانہ ہے۔ زندگی کا دریا اس وقت اپنی طغیانی پر ہے، ملک ملک اور قوم قوم کے درمیان سخت کشمکش برپا ہے اور یہ کشمکش اتنی گہرائی تک اُتری ہوئی ہے کہ بڑے بڑے مجمعوں سے گذر کر فرد فرد تک کو نزاع کے میدان میں کھینچ لائی ہے۔ اس طرح عالمِ انسان کے بیشتر حصّہ نے اپنے وہ تمام اخلاقی اوصاف اُگل کر منظرِ عام پر رکھ دیئے ہیں جنھیں وہ مدّتوں سے اندر ہی اندر پرورش کر رہے تھے۔ اب ہم ان گندگیوں کو علانیہ سطحِ زندگی پر دیکھ رہے ہیں جن کو تلاش کرنے کے لئے پہلے کچھ نہ کچھ تعمّق کی ضرورت تھی۔ اب صرف ایک مادرزاد اندھا ہی اس غلط فہمی میں مبتلا رہ سکتا ہے کہ "بیمار کا حال اچھا ہے" اور صرف وہی لوگ بیماری کی تشخیص اور علاج کی فکر سے

غافل رہ سکتے ہیں جو حیوانات کی طرح اخلاقی حس سے بالکل خالی ہیں یا جن کے اخلاقی احساسات پر فالج گر گیا ہے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ پوری پوری قومیں بہت بڑے پیمانے پر ان بدترین اخلاقی صفات کا مظاہرہ کر رہی ہیں جن کو ہمیشہ سے انسانیت کے ضمیر نے انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے بے انصافی، بے رحمی، ظلم و ستم، جھوٹ دغا، فریب، مکر، بدعہدی، خیانت، بے شرمی، نفس پرستی، استحصال بالجبر اور ایسے ہی دوسرے جرائم محض انفرادی جرائم نہیں رہے ہیں بلکہ قومی اخلاق کی حیثیت سے ظاہر ہو رہے ہیں، دنیا کی بڑی بڑی قومیں اجتماعی حیثیت سے وہ سب کچھ کر رہی ہیں جس کا ارتکاب کرنے والے افراد ابھی تک ان کے ہاں جیلوں میں ٹھونسے جاتے ہیں۔ ہر قوم نے چھانٹ چھانٹ کر اپنے بڑے سے بڑے مجرموں کو اپنا لیڈر اور سربراہ کار بنایا ہے اور ان کی قیادت میں بد معاشی کی کوئی مکروہ سے مکروہ قسم ایسی نہیں رہ گئی ہے جس کا کھلم کھلا نہایت بے حیائی کے ساتھ وسیع پیمانے پر وہ ارتکاب نہ کر رہی ہوں ہر قوم دوسری قوم کے خلاف جھوٹ تصنیف کر کر کے علانیہ نشر کر رہی ہیں اور ریڈیو کے ذریعہ سے ان جھوٹوں نے فضائے بسیط تک کو گندہ کر دیا ہے پورے پورے ملکوں اور براعظموں کی آبادیاں لٹیروں اور ڈاکوؤں میں تبدیل ہو گئی ہیں اور ہر ڈاکو عین

اس وقت جب کہ وہ خود ڈاکہ مار رہا ہوتا ہے، نہایت بے شرمی کے ساتھ اپنے مقابل کے ڈاکہ کی ان ساری گناہ گاریوں کا تذکرہ کرتا ہے جن سے داغ دار ہونے میں اس کا اپنا دامن بھی اپنے حریف سے کچھ کم سیاہ نہیں ہوتا۔ انصاف کے معنی ان ظالموں کے نزدیک صرف اپنی قوم کے ساتھ انصاف کے رہ گئے ہیں۔ حق جو کچھ ہے ان کے لئے ہے۔ دوسروں کے حقوق پر ہر دست درازی ان کے اخلاقی قانون میں جائز بلکہ کارِ ثواب ہے۔ قریب قریب تمام قوموں کا حال یہ ہو چکا ہے کہ ان کے ہاں لینے کے پیمانے اور ہیں اور دینے کے اور جتنے معیار وہ اپنے مفاد کے لئے قائم کرتی ہیں، دوسروں کا مفاد سامنے آتے ہی وہ سب معیار بدل جاتے ہیں، اور جن معیاروں کا وہ دوسروں سے مطالبہ کرتی ہیں ان کی پابندی کرنا خود حرام سمجھتی ہیں۔ بدعہدی کا مرض اس حد کو پہنچ چکا ہے کہ اب ایک قوم کو دوسری قوم پر کوئی اعتماد باقی نہیں رہا۔ بڑی بڑی قوموں کے نمائندے نہایت مہذب صورتیں لئے ہوئے جب بین الاقوامی معاہدوں پر دستخط کر رہے ہوتے ہیں، اس وقت ان کے دلوں میں یہ خبیث نیت چھپی ہوئی ہوتی ہے کہ پہلا موقع ملتے ہی اس مقدس بکرے کو قومی مفاد کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھائیں گے۔ اور جب ایک قوم کا صدر یا وزیر اعظم اس قربانی کے لئے چھری تیز کرتا ہے تو پوری قوم میں سے ایک آواز بھی اس بد اخلاقی کے

خلاف نہیں اُٹھتی، بلکہ ملک کی پوری آبادی اِس جرم میں شریک ہو جاتی ہے۔ مکاری کا حال یہ ہے کہ بڑے بڑے پاکیزہ اخلاقی اصولوں کی گفتگو کی جاتی ہے صرف اس لئے کہ دنیا کو بے وقوف بنا کر اپنے مفاد کی خدمت اس سے لی جائے اور سادہ لوح انسان کو یقین دلایا جائے کہ تم سے جان و مال کی قربانی کا مطالبہ جو ہم کر رہے ہیں یہ کچھ اپنے لئے نہیں ہے بلکہ ہم بے غرض نیکوں کے نیک لوگ یہ ساری تکلیفیں محض انسانیت کی بھلائی کے لئے برداشت کر رہے ہیں، سنگدلی و بے رحمی اس مرتبۂ کمال پر پہنچی ہے کہ ایک ملک جب دوسرے ملک پر حملہ آور ہوتا ہے تو اس کی آبادی کو روندنے اور کچلنے میں محض اسٹیم رولر کی سی بے حسی ہی اس سے ظاہر نہیں ہوتی بلکہ وہ مزے لے لے کر دنیا کو اپنے ان کارناموں کی اطلاع دیتا ہے، گویا اسے معلوم ہے کہ اب دنیا انسانوں سے نہیں بلکہ صرف بھیڑیوں سے آباد ہے، خود غرضانہ شقاوت اس انتہا کو پہنچ چکی ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کو اپنے مفاد کے لئے مسخر کرنے کے بعد صرف یہی نہیں کہ بے دردی کے ساتھ اسے لوٹتی کھسوٹتی ہے بلکہ نہایت منظم طریقہ سے پیہم کوشش کرتی رہتی ہے کہ انسانیت کے تمام شریفانہ خصائل سے اس کو خالی کر دے اور وہ تمام کمینہ اوصاف اس کے اندر پرورش کرے جنہیں وہ خود نہایت گھناؤنا سمجھتی ہے۔

یہ چند نمایاں ترین اخلاقی خرابیاں ہیں جنہیں محض نمونے کے طور پر بیان

کی ہیں، ورنہ تفصیل کے ساتھ اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پوری انسانیت کا جسم اخلاقی حیثیت سے سڑ گیا ہے۔ پہلے قحبہ خانے اور قمار بازی کے اڈے اخلاقی پستی کے سب سے بڑے پھوڑے سمجھے جاتے تھے، لیکن اب تو ہم جدھر دیکھتے ہیں انسانی تمدن پورا کا پورا ہی ایک پھوڑا نظر آرہا ہے۔ قوموں کی پارلیمنٹیاں اور اسمبلیاں، حکومتوں کے سکریٹریٹ اور وزارت خانے، عدالتوں کے ایوان اور وکالت خانے، پریس اور نشترگاہیں، یونیورسٹیاں اور تعلیمی ادارے بینک اور صنعتی و تجارتی کاروبار کے مجامع، سب کے سب پھوڑے ہی پھوڑے ہیں جو کسی تیز نشتر کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ علم جو انسانیت کا عزیز ترین جوہر ہے آج اس کا ہر شعبہ انسانیت کی تباہی کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ طاقت اور زندگی کے تمام وسائل جو قدرت نے انسان کے لئے مہیا کئے تھے فساد اور خرابی کے کاموں میں ضائع کئے جا رہے ہیں۔ اور وہ صفات بھی جو انسان کی بہترین اخلاقی صفات سمجھی جاتی تھیں مثلاً شجاعت، ایثار، قربانی، فیاضی، صبر، تحمل، اولوالعزمی، بلند حوصلگی وغیرہ، آج ان کو بھی چند بڑی اور بنیادی بداخلاقیوں کا خادم بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اجتماعی خرابیاں اس وقت ابھر کر نمایاں ہوتی ہیں جب انفرادی خرابیاں پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہوتی ہیں، آپ اس بات کا تصور نہیں کر سکتے کہ کسی سوسائٹی کے بیشتر افراد نیک کردار ہوں اور وہ

سوسائٹی بہ حیثیت مجموعی بدکرداری کا مظاہرہ کرے۔ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ نیک کردار لوگ اپنی قیادت اور نمایندگی اور سربراہ کاری بدکردار لوگوں کے ہاتھ میں دے دیں، اور اس بات پر راضی ہو جائیں کہ ان کے قومی اور ملکی اور بین الاقوامی معاملات کو غیر اخلاقی اصولوں پر چلایا جائے اس لئے جب وسیع پیمانے پر دنیا کی قومیں ان گھناؤنے اور رذیل اخلاقی اوصاف کا اظہار اپنے اجتماعی اداروں کے ذریعہ سے کر رہی ہیں، تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آج نوعِ انسانی اپنی تمام علمی و تمدّنی ترقیوں کے باوجود ایک شدید اخلاقی تنزل میں مبتلا ہے اور اس کے بیشتر افراد اس وبا سے متاثر ہو چکے ہیں۔ یہ حالت اگر یوں ہی ترقی کرتی رہی تو وہ وقت دور نہیں جب انسانیت کسی بہت بڑی تباہی سے دوچار ہوگی۔ اور ایک طویل عہدِ ظلمت اس پر چھا جائے گا۔

اب اگر ہم آنکھیں بند کر کے تباہی کے گڑھے کی طرف سرپٹ جانا نہیں چاہتے تو ہمیں کھوج لگانا چاہئے کہ اس خرابی کا سرچشمہ کہاں ہے جہاں سے یہ طوفان کی طرح امڈی چلی آ رہی ہے۔ چونکہ یہ اخلاقی خرابی ہے لہٰذا لامحالہ ہمیں اس کا سراغ ان اخلاقی تصورات ہی میں ملے گا جو اس وقت دنیا میں پائے جاتے ہیں۔

دنیا کے اخلاقی تصورات کیا ہیں؟ اس سوال کی جب ہم تحقیق کرتے

ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اصولاً یہ تمام تصوّرات دو بڑی قسموں پر منقسم ہیں:۔
ایک قسم کے تصوّرات وہ جو خدا اور حیات بعد موت کے عقیدے پر مبنی ہیں۔

دوسری قسم کے تصوّرات وہ جو ان عقیدوں سے الگ ہٹ کر کسی دوسری بنیاد پر قائم ہوتے ہیں۔

آیئے اب ہم ان دونوں قسم کے تصوّرات کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ دنیا میں اس وقت یہ کس صورت میں پائے جاتے ہیں اور ان کے نتائج کیا ہیں۔

خدا اور حیات بعد موت کے عقیدے پر جتنے اخلاقی تصوّرات قائم ہوتے ہیں ان کی صورت کا تمام تر انحصار اس عقیدے کی نوعیت پر ہوتا ہے جو خدا اور حیات بعد موت کے متعلق لوگوں میں پایا جاتا ہو۔ لہٰذا ہمیں دیکھنا چاہیے کہ دنیا اس وقت خدا کو کس شکل میں مان رہی ہے اور دوسری زندگی کے متعلق اس کے عام تخیلات کیا ہیں۔

خدا کو ماننے والے بیشتر انسان اس وقت شرک میں مبتلا ہیں۔ انھوں نے اپنے زعم میں خدائی کے اکثر اختیارات جن کا تعلق ان کی اپنی زندگی سے ہے، دوسری ہستیوں پر تقسیم کر دیئے ہیں اور ان ہستیوں کا خیالی نقشہ اپنی خواہشات کے مطابق ایسا بنا لیا ہے کہ وہ اپنے ان خدایانہ اختیارات کو

ٹھیک اسی طرح استعمال کرتی ہیں جس طرح یہ چاہتے ہیں کہ وہ استعمال کریں۔
یہ گناہ کرتے ہیں وہ بخشوا لیتی ہیں۔ یہ فرائض سے غافل اور حقوق سے بے پروا
ہو کر بے مہار جانور کی طرح حرام و حلال کی تمیز کے بغیر دنیا کی کھیتی کو چرتے
پھرتے ہیں اور وہ کچھ نذر و نیاز کے عوض ان کی نجات کی ضمانت لے لیتی ہیں
یہ چوری بھی کرنے جاتے ہیں تو ان کی عنایت سے نہاں دار سونارہ جاتا
ہے۔ اِن کے اور اُن کے درمیان یہ سودا طے ہو گیا ہے کہ یہ ان کی طرف
سے عقیدہ اچھا رکھیں اور نذر پیش کرتے رہیں، اور اس کے جواب میں وہ
ان کے سب کام جو کچھ بھی یہ کرنا چاہیں بناتی رہیں گی اور مرنے کے بعد جب
خدا انھیں پکڑنا چاہے گا تو وہ بیچ میں حائل ہو کر کہہ دیں گی کہ یہ ہمارے دامن
کے سایہ میں ہیں، ان سے کچھ نہ کہا جائے بلکہ بعض جگہ تو اس پکڑ دھکڑ کی نوبت
ہی نہ آئے گی کیونکہ ان کے گناہوں کا کفارہ پہلے ہی کوئی ادا کر چکا ہے۔
ان مشرکانہ عقائد نے زندگی بعد موت کے عقیدے کو بے معنی کر دیا ہے،
اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ساری اخلاقی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں جو مذہب
نے تعمیر کی تھیں، مذہبی اخلاقیات کتابوں میں لکھے ہوئے موجود ہیں،
اور زبانوں پر ان کا ذکر بھی احترام کے ساتھ آتا ہے مگر عملاً ان کی پابندی
سے بچنے کے لئے شرک نے فرار کی بے شمار راہیں فراہم کر دی ہیں اور
کچھ اس شان سے فراہم کی ہیں کہ جس راہ سے بھی یہ چاہیں بھاگیں بہرحال

انھیں اطمینان ہے کہ آخر کار پہنچیں گے نجات ہی کی منزل پر۔

شرک سے قطع نظر کر کے جہاں خدا پرستی اور عقیدۂ آخرت کچھ بہتر صورت میں موجود ہے، وہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کے مطالبات سکڑ کر انسانی زندگی کے ایک بہت چھوٹے دائرے میں محدود ہو گئے ہیں۔ چند اعمال، چند رسوم اور چند پابندیاں ہیں جن کا محدود انفرادی و معاشرتی زندگی میں خدا ان سے مطالبہ کرتا ہے اور ان ہی کے معاوضے میں اس نے ایک بہت بڑی جنّت ان کے لئے مہیّا کر رکھی ہے۔ اگر یہ ان مطالبوں کو پورا کر دیں تو پھر کوئی چیز خدا کی طرف سے ان کے لئے کرنے کی نہیں رہ جاتی اس کے بعد یہ آزاد ہیں کہ اپنی زندگی کے معاملات جس طرح چاہیں چلائیں۔ اور اگر ان خدائی مطالبوں میں بھی کوتاہی رہ جائے تو اس کی رحمت اور نکتہ نوازی پر بھروسا ہے کہ وہ گناہوں کے پشتارے ان سے جنّت کے دروازے پر رکھوا لے گا اور اندر جانے کے لئے اعزازی ٹکٹ عنایت فرما دے گا۔ اس تنگ مذہبی تصوّر نے اوّل تو زندگی کے معاملات پر مذہبی اخلاقیات کے انطباق کو بہت محدود کر دیا ہے جس کی وجہ سے زندگی کے تمام بڑے بڑے شعبے ہر اس اخلاقی رہنمائی اور بندش سے آزاد ہو گئے ہیں جو مذہب سے حاصل ہو سکتی تھی؛ دوسرے اس تنگ دائرے میں بھی اخلاق کی گرفت سے بچ نکلنے کے لئے

ایک راستہ یہاں کھلا ہوا ہے جس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں کم ہی لوگ سُستی دکھاتے ہیں۔

ان سب سے بہتر حالت ان مذہبی طبقوں کی ہے، جو شرک سے بھی پاک ہیں، سچائی کے ساتھ خدا کو بھی مانتے ہیں، اور آخرت کے متعلق بھی کسی جھوٹے بھروسے پر تکیہ نہیں کر بیٹھے ہیں ان کے اندر اخلاق کی پاکیزگی تو بیشک پائی جاتی ہے، اور بہترین سیرت و کردار کے لوگ ان میں مل جاتے ہیں، لیکن ان کو بالعموم مذہب و روحانیت کے محدود تصوّر نے خراب کر رکھا ہے۔ وہ دنیا اور اس کے مسائلِ زندگی سے بڑی حد تک بے تعلق ہو کر یا تو چند مخصوص کاموں کو جنھیں مذہبی کام سمجھا جاتا ہے لے بیٹھے ہیں، یا اپنے نفس کو مانجھ مانجھ کر صاف کرتے ہیں تاکہ وہ اس دنیا ہی میں عالمِ غیب کی آوازیں سننے اور حسنِ مطلق کی پرچھائیاں دیکھنے کے قابل ہو جائیں۔ ان کے نزدیک نجات کا راستہ دنیوی زندگی کے کنارے کنارے بچ کر نکل جاتا ہے اور خدا کے قُرب سے سرفراز ہونے کی سبیل بس یہ ہے کہ ایک طرف مذہب کے دیئے ہوئے نقشے پر اپنی زندگی کے ظاہری پہلوؤں کو ڈھال لیا جائے، دوسری طرف نفس کی صفائی کے چند طریقوں سے کام لے کر اسے مجلّٰی و مصفّا کر لیا جائے اور پھر ایک محدود دائرے کے اندر کچھ مذہبی و روحانی مشاغل میں مصروف رہ کر

زندگی کے دن پورے کر دیئے جائیں۔ گویا ان کے خدا کو چند خوش وضع شیشے کے برتن چند مقطع لاؤڈ اسپیکر، چند عمدہ گراموفون، چند لطیف ریڈیو سیٹ، چند خوشنما فوٹو کے کیمرے درکار تھے اور اسی غرض کے لئے اس نے زمین میں اتنا کچھ سامان دے کر انسانوں کو بھیجا تاکہ یہاں سے اپنے آپ کو ان چیزوں میں تبدیل کر کے پھر اس کے پاس واپس پہنچ جائیں۔ مذہب و روحانیت کے اس غلط تصور کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ جو نفوس بلند تر اور پاکیزہ تر اخلاقی صلاحیتوں کے حامل تھے انھیں یہ زندگی کے میدان سے ہٹا کر گوشوں میں لے گیا اور گھٹیا درجہ کے اوصاف رکھنے والوں کے لئے بغیر مزاحمت کے خود بخود میدان خالی ہو گیا۔

دنیا کی پوری مذہبی صورتِ حال کا یہ لب لباب ہے اور اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ خدا پرستی سے جو اخلاقی طاقت انسان کو ملنی ممکن تھی، بیشتر انسان تو اس کو سرے سے حاصل ہی نہیں کر رہے ہیں، اور ایک بہت قلیل تعداد اس کو حاصل کر رہی ہے لیکن انسانیت کی رہنمائی و سربراہ کاری سے وہ خود دست بردار ہو گئی ہے اس لئے اس کا حال اس بیٹری کا سا ہے جس میں بجلی بھری جائے اور وہ یونہی رکھے رکھے اپنی عمر پوری کر دے۔

انسانی تمدن کی گاڑی بالفعل جو لوگ اس وقت چلا رہے ہیں ان کے اخلاقیات خدا اور آخرت کے اساسی تخیل سے خالی ہیں اور دانستہ خالی کئے گئے ہیں، نیز اخلاق میں خدا کی رہنمائی قبول کرنے سے انھوں نے قطعی انکار کر دیا ہے۔ اگرچہ ان میں کثیر التعداد لوگ کسی نہ کسی مذہب کے قائل ہیں، مگر ان کے نزدیک مذہب ہر انسان کا محض ایک شخصی وانفرادی معاملہ ہے جسے اپنی ذات تک آدمی کو محدود رکھنا چاہئے، اجتماعی زندگی اور اس کے معاملات سے مذہب کو کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔ پھر اس کی کیا ضرورت کہ وہ ان معاملات کو چلانے کے لئے کسی فوق الفطری ہدایت کی طرف رجوع کریں۔ گذشتہ صدی کے اواخر میں جس اخلاقی تحریک کی ابتدا امریکہ سے ہوئی تھی اور جو بڑھتے بڑھتے انگلستان اور دوسرے ممالک میں پھیل گئی، اس کا بنیادی مسلک (AMERICAN ETHICAL UNION) کے مقاصد کی فہرست میں بایں الفاظ واضح کیا گیا تھا:۔

"انسانی زندگی کے تمام تعلقات میں خواہ وہ شخصی ہوں، اجتماعی ہوں، قومی ہوں یا بین الاقوامی، اخلاق کی انتہائی اہمیت پر زور دینا بغیر اس کے کہ مذہبی معتقدات یا مابعد الطبیعی تخیلات کا اس میں کوئی دخل ہو۔"

اس تحریک کے زیر اثر انگلستان میں (UNION OF
ETHICAL SOCIETIES) قائم ہوئی جو بعد میں (ETHICAL
UNION) میں ضم ہو گئی۔ اس کا اساسی مقصد یہ بیان کیا گیا تھا۔

"انسانی رفاقت اور خدمت کے ایک ایسے طریقہ کی تلقین کرنا جو اس اصول پر مبنی ہو کہ مذہب کا سب سے بڑا مقصد بھلائی کی محبت ہے اور یہ کہ اخلاقی تصوّرات اور اخلاقی زندگی کے لئے دنیا کی حقیقت اور زندگی بعد موت کے متعلق کسی عقیدے کی حاجت نہیں ہے، اور یہ کہ خالص انسانی اور فطری ذرائع سے انسانوں کو اپنے تمام تعلقاتِ زندگی میں حق سے محبت کرنے، حق جاننے اور حق پر عمل کرنے کے لئے تیار کیا جائے۔"

ان الفاظ میں درحقیقت اس پورے طبقے کی نمائندگی کی گئی ہے جو اس وقت دنیا کے افکار، تہذیب، تمدن، اور معاملات کی رہنمائی کر رہا ہے۔ آج دنیا کے کاروبار کو عملاً جو لوگ چلا رہے ہیں ان سب کے ذہن پر وہی تخیل چھایا ہوا ہے جو اوپر کے چند فقروں میں بیان کیا گیا ہے۔ سب ہی نے بالفعل اپنے اخلاقیات کو خدا اور آخرت کے عقیدے اور مذہب کی اخلاقی رہنمائی سے آزاد کر لیا ہے۔ اب ہمیں ان اخلاقی فلسفوں کا جائزہ لے کر دیکھنا چاہئے کہ ان کی

کیا کیفیت ہے۔

فلسفۂ اخلاق کا پہلا بنیادی سوال یہ ہے کہ وہ اصلی اور انتہائی بھلائی کیا ہے جس کو پہنچنا انسانی سعی وعمل کا مقصود ہونا چاہئے اور جس کے معیار پر انسان کے طرزِ عمل کو پرکھ کر فیصلہ کیا جائے کہ وہ اچھا ہے یا برا، صحیح ہے یا غلط؟

اس سوال کا کوئی جواب انسان نہیں پا سکا۔ اس کے بہت سے جوابات ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک وہ بھلائی خوشی ہے، دوسرے کے نزدیک کمال ہے، تیسرے کے نزدیک فرض برائے فرض ہے۔

پھر خوشی کے متعلق سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ کیسی خوشی؟ آیا وہ جو جسمانی ونفسانی خواہشات کے پورا ہونے سے حاصل ہوتی ہے؟ یا وہ جو ذہنی ترقی کے مدارج پر چڑھنے سے حاصل ہوتی ہے؟ یا وہ جو اپنی شخصیت کو آرٹ یا روحانیت کے نقطۂ نظر سے آراستہ کر لینے سے حاصل ہوتی ہے؟ نیز یہ کہ کس کی خوشی؟ ہر شخص کی اپنی خوشی؟ یا اس جماعت کی خوشی جس سے انسان وابستہ ہے؟ یا تمام انسانوں کی خوشی؟ یا فی الجملہ دوسروں کی خوشی؟

اسی طرح کمال کو مقصود قرار دینے والوں کے لئے بھی بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کمال کا تصور اور اس کا معیار کیا ہے؟ اور کمال کس کا مقصود ہے؟ فرد کا؟ جماعت کا؟ یا انسانیت کا؟

اسی طرح جو لوگ فرض برائے فرض کے قائل ہیں، اور ایک غیر مشروط واجب الاطاعت قانونِ فرض (CATEGORICAL-IMPERATIVE) کی بے چون وچرا اطاعت ہی کو آخری و انتہائی بھلائی قرار دیتے ہیں ان کے لئے بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ قانون فی الواقع ہے کیا؟ کس نے اس کو بنایا؟ اور کس کا قانون ہونے کی وجہ سے وہ واجب الاطاعت ہے؟

ان تمام سوالات کے جوابات مختلف گروہوں کے نزدیک مختلف ہیں۔ محض فلسفہ کی کتابوں ہی میں مختلف نہیں ہیں بلکہ عملاً بھی مختلف۔ یہ ساری انسانوں کی بھیڑ جو آپ کے سامنے تمدنِ انسانی کی گاڑی کو چلا رہی ہے جس میں سلطنتوں کو چلانے والے وزیر، فوجوں کو لڑانے والے جنرل، انسانوں کے درمیان فیصلہ کرنے والے جج، انسانی معاملات کے قانون بنانے والے شارعین، انسانوں کو تیار کرنے والے معلّم، انسان کے معاشی ذرائع کو کنٹرول کرنے والے کاروباری لوگ، اور تمدّن کے کارخانے میں کام کرنے والے مختلف مدارج کے کارکن سب ہی شامل ہیں، ان کے پاس بھلائی کا کوئی ایک معیار نہیں ہے۔ بلکہ ہر ایک شخص اور ہر ایک گروہ اپنا الگ معیار رکھتا ہے اور ایک تمدنی نظام میں کام کرتے ہوئے بھی ہر ایک کا رُخ ایک الگ مقصود

کی طرف پھرا ہوا ہے۔ کسی کے نزدیک اپنی خوشی منتہا ہے اور خوشی سے
اس کی مراد نفسانی و جسمانی خواہشات کی تکمیل ہے۔ کوئی اپنی خوشی کے
پیچھے پڑا ہوا ہے اور اس سے ذہن میں کچھ اور مراد ہے۔ اس ذاتی خوشی
کے حصول اور عدم حصول ہی کے لحاظ سے وہ فیصلہ کر رہا ہے کہ اجتماعی
زندگی میں اس کے لئے کون سا طرز عمل نیک ہے یا بد، مگر اس کی ظاہری
شریفانہ صورت سے ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انسانی
سوسائٹی کے لئے وہ ایک موزوں وزیر یا جج، یا معلّم یا کسی دوسری
حیثیت سے تمدّن کی مشین کا ایک اچھا پُرزہ ہے۔ اسی طرح کوئی خوشی
سے مراد انسانوں کے اس مخصوص مجموعہ کی خوشی و خوش حالی سمجھتا ہے
جس کے ساتھ اس کی دل چسپیاں وابستہ ہیں اور یہی اس کے نزدیک
وہ خیر برتر ہے جس کے حصول .... کی سعی کرنا اس کے نزدیک
نیکی ہے۔ یہ نقطۂ نظر اسے اپنے طبقہ یا اپنی قوم کے سوا ہر ایک کے لئے
سانپ اور بچھو بنا دیتا ہے۔ لیکن ہم اس کی ظاہری مہذب صورت
کی وجہ سے اس کو ایک شریف انسان فرض کر لیتے ہیں۔ ایسی ہی
مختلف اقسام کی شخصیتیں کمال کو خیر اعلیٰ ماننے والوں اور فرض
برائے فرض کے قائلین میں پائی جاتی ہیں جن میں سے اکثر کے
نظریات اپنے عملی نتائج کے اعتبار سے انسانی تہذیب و تمدّن کے لئے

زہر کا حکم رکھتے ہیں مگر وہ تریاق کا لیبل لگائے ہوئے ہماری اجتماعی زندگی میں جذب ہوئے چلے جا رہے ہیں۔

اب آگے چلئے۔ فلسفۂ اخلاق کے بنیادی سوالات میں سے دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ ہمارے پاس خیر و شر کے جاننے کا ذریعہ کیا ہے؟ کس ماخذ کی طرف ہم یہ معلوم کرنے کے لئے رجوع کریں کہ اچھا کیا ہے اور برا کیا، صحیح کیا ہے اور غلط کیا؟

اس سوال کا بھی کوئی ایک جواب انسان کو نہیں ملا۔ اس کے بھی بہت سے جوابات ہیں۔ کسی کے نزدیک وہ ذریعہ اور ماخذ انسانیت کا تجربہ ہے، کسی کے نزدیک قوانینِ حیات اور حالاتِ وجود کا علم ہے۔ کسی کے نزدیک وجدان ہے، کسی کے نزدیک عقل ہے، یہاں پہنچ کر وہ بدنظمی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے جس کا آپ نے پہلے سوال کے معاملہ میں مشاہدہ کیا۔ ان چیزوں کو ماخذ قرار دینے کے بعد اخلاق کے لئے مستقل اصول ہی یہ قرار پاتا ہے کہ اس کا کوئی متعین معیار نہ ہو بلکہ وہ ایک سیّال مادّے کی طرح بہتا اور مختلف صورتوں اور پیمانوں میں ڈھلتا چلا جائے۔

انسانیت کے تجربے سے صحیح علم حاصل کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ اس کے متعلق مکمّل اور مفصل معلومات یک جا ہوں اور کوئی ہمہ بیں

اور کامل متوازن ذہن ان سے نتائج اخذ کرے۔ لیکن یہ دونوں چیزیں حاصل نہیں ہیں۔ اوّل تو انسانیت کا تجربہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ بلکہ جاری ہے۔ پھر اب تک جو تجربہ ہے اس کے بھی مختلف اجزا مختلف لوگوں کے سامنے ہیں اور وہ مختلف طور پر اپنی ذہنیت کے مطابق ان سے نتائج نکال رہے ہیں۔ تو کیا ان ناقص معلومات سے نامکمل ذہن اپنے رجحانات کے مطابق جو نتائج اخذ کریں وہ سب صحیح ہو سکتے ہیں؟ اگر نہیں، تو کیسے سخت بیمار ہیں وہ ذہن جو اپنے خیر و شر کو جاننے کے لئے اس ذریعۂ علم کو کافی سمجھتے ہیں۔

یہی معاملہ قوانینِ حیات اور حالاتِ وجود کا ہے، یا تو آپ اخلاقی بھلائی اور برائی کو جاننے کے لئے اس وقت کا انتظار کریں جب ان قوانین اور حالات کا علم قابل اطمینان حد تک آپ کی گرفت میں آجائے، یا نہیں تو ناکافی معلومات کو ناکافی جانتے ہوئے انہی کی بنیاد پر مختلف ذہنیت اور مختلف مراتبِ علمی کے لوگ مختلف طور پر فیصلے کرتے رہیں کہ ان کے لئے خیر کیا ہے اور شر کیا، اور علم کی ہر نئی قسط حاصل ہونے کے بعد ان فیصلوں کو بدلتے بھی رہیں حتیٰ کہ آج کا خیر کل شر ہو جائے اور آج کا شر کل خیر قرار پائے۔

عقل اور وجدان کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے بلاشبہہ خیر و شر کو جاننے کی کچھ استعداد عقل کو بھی حاصل ہے اور اس عقل سے ہر انسان نے کچھ نہ کچھ حصّہ پایا ہے، اور خیر و شر کا کچھ علم وجدانی بھی ہے جس کا الہام ہر انسان کے ضمیر پر فطرۃً ہوتا ہے، لیکن اس علم کے لئے ان میں سے کوئی بھی کافی بالذّات نہیں کہ اسی کو آخری اور واحد ذریعۂ علم کی حیثیت سے لے لیا جائے، عقل یا وجدان، جس کو بھی آپ کافی بالذّات سمجھیں گے، بہرحال ایک ایسے ذریعۂ علم پر آپ اعتماد کریں گے جو نہ صرف یہ کہ اپنی فطرت میں ناقص و محدود ہے، بلکہ وہ مختلف اشخاص، مختلف طبقوں، مختلف حالات اور مختلف زمانوں میں پہنچ کر بالکل مختلف چیزوں پر خیر یا شر ہونے کا حکم لگاتا ہے.

یہ ساری بدنظمی جس کا میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا ہے، محض علمی مقالات اور فلسفیانہ بحثوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ فی الواقع دنیا کے تمدّن اور تہذیب میں عملاً اس کا عکس پوری پوری طرح نمایاں ہو رہا ہے۔ آپ کے تمدّن میں جو لوگ کام کر رہے ہیں، خواہ وہ کارفرمائی کے مقام پر ہوں یا کارکنی کے مقام پر یا کارفرماؤں اور کارکنوں کے بنانے میں لگے ہوئے ہوں، یہ سب خیر و شر اور صحیح و غلط جاننے کے لئے اپنے اپنے طور پر انہی ماخذوں کی طرف رجوع

کر رہے ہیں، اور ہر گروہ کا خیر و شر دوسرے کے خیر و شر سے الگ ہے حتّیٰ کا ایک کا خیر دوسرے کا انتہائی شر ہے اور ایک کا شر دوسرے کا انتہائی خیر۔ اس بدنظمی نے اخلاق کے لئے کوئی پائیدار بنیاد باقی ہی نہیں رہنے دی ہے۔ جن چیزوں کو دنیا میں ہمیشہ سے جُرم اور گناہ سمجھا جاتا رہا ہے آج کسی نہ کسی گروہ کی نگاہ میں وہ عین خیر ہیں یا مطلقاً خیر نہیں تو اضافی خیر بن گئی ہیں۔ اسی طرح جن بھلائیوں کو ہمیشہ سے انسان خوبی سمجھتا رہا ہے ان میں سے اکثر آج حماقت اور مضحکہ قرار پا چکی ہیں اور مختلف گروہ ان کو شرم کے ساتھ نہیں بلکہ فخر کے ساتھ علانیہ پامال کر رہے ہیں۔ پہلے جھوٹا جھوٹ بولتا تھا مگر معیارِ اخلاق سچائی ہی کو مانتا تھا۔ لیکن آج کے فلسفوں نے جھوٹ کو خیر بنا دیا ہے اور جھوٹ بولنے کا ایک مستقل فن مدون کیا جا رہا ہے۔ اور بڑے پیمانے پر قومیں اور سلطنتیں جھوٹ پھیلا رہی ہیں۔ یہی حال ہر بد اخلاقی کا ہے کہ پہلے بد اخلاقیاں، بد اخلاقیاں ہی تھیں مگر آج نئے فلسفوں کے طفیل میں وہ سب مطلق یا اضافی خیر میں تبدیل کر دی گئی ہیں۔

فلسفۂ اخلاق کے بنیادی سوالات میں سے تیسرا سوال یہ ہے کہ قانونِ اخلاق کے پیچھے وہ قوت کون سی ہے جس کے زور سے

یہ قانون نافذ ہو؟ اس کے جواب میں مسرت اور کمال کے پرستار کہتے ہیں کہ خوشی یا کمال کی طرف لے جانے والی بھلائیاں اپنی پیروی کرانے کی طاقت آپ رکھتی ہیں اور رنج یا پستی کی طرف لے جانے والی برائیاں آپ اپنے ہی زور پر اپنے سے اجتناب کرا لیتی ہیں۔ اس کے سوا قانونِ اخلاق کے لئے کسی خارجی اقتدار کی ضرورت ہی نہیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ قانونِ فرض انسان کے ارادۂ معقول کا اپنے اوپر آپ عائد کردہ قانون ہے، اس کے لئے کسی بیرونی زور کی حاجت نہیں۔ تیسرا گروہ سیاسی اقتدار کو قانونِ اخلاق کی اصل قوتِ نافذہ سمجھتا ہے اور اس مسلک کی رُو سے اسٹیٹ کی طرف وہ تمام اختیارات منتقل ہو جاتے ہیں جو پہلے خدا کے لئے تھے، یعنی باشندوں کے حق میں یہ فیصلہ کرنا کہ انھیں کیا کرنا چاہئے اور کیا نہ کرنا چاہئے۔ چوتھے گروہ نے یہ مرتبہ اسٹیٹ کے بجائے سوسائٹی کو دیا ہے۔ یہ سب جوابات فساد کی بے شمار صورتیں دنیا میں عملاً پیدا کر چکے ہیں اور اب تک کر رہے ہیں پہلے دونوں جوابوں نے انفرادی خودسری و بے راہ روی یہاں تک بڑھا دی کہ اجتماعی زندگی کا شیرازہ درہم برہم ہونے کے قریب پہنچ گیا۔ پھر اس کا ردِّ عمل ان فلسفوں

کی صورت میں رونما ہوا جنھوں نے یا تو اسٹیٹ کو خدا بنا کر افراد کو بالکل اس کا بندہ بنا ڈالا، یا پھر افراد کی روٹی کے ساتھ ان کے خیر و شر کی باگیں بھی اجتماع کے ہاتھوں میں دے دیں، حالانکہ سبّوح و قدّوس نہ اسٹیٹ ہے نہ اجتماع۔

یہی معاملہ اس سوال کے جواب میں پیش آتا ہے کہ وہ کون سا محرک ہے جو انسان کو اپنے طبعی رجحانات کے علی الرغم اخلاقی احکام کی پابندی پر آمادہ کرے؟ کسی کے نزدیک بس خوشی کی طمع اور رنج و تکلیف کا خوف اس کے لئے کافی محرّک ہے۔ کوئی محض کمال کی خواہش اور نقص سے بچنے کی تمنّا کو اس کے لئے کافی سمجھتا ہے۔ کوئی اس کے لئے محض آدمی کے اپنے جذبۂ احترامِ قانون پہ اعتماد کرتا ہے۔ کوئی اسٹیٹ کے اجر کی امید اور اس کے غضب کے خوف کو اہمیت دیتا ہے اور کوئی اجتماع کے اجر اور اس کے غضب کو طمع و خوف کے لئے استعمال کرنے پر زیادہ زور دیتا ہے۔ ان میں سے ہر جواب نے عملاً ہمارے اخلاقی نظامات میں سے کسی نہ کسی کے اندر تقدم کا مقام حاصل کیا ہے، اور تھوڑا سا تجسّس کرنے پر یہ حقیقت بہ آسانی کھل سکتی ہے کہ یہ سب محرکات بد اخلاقی کے لئے بھی اتنے ہی اچھے محرّک بن سکتے ہیں جتنے خوش اخلاقی کے لئے بلکہ ان میں بد اخلاقی کے لئے محرّک بننے کی

قوت بہت زیادہ ہے۔ اور بہرحال کسی اعلیٰ درجہ کی اخلاقیت کے لئے تو یہ تمام محرکات قطعاً ناکافی ہیں۔

یہ بہت مختصر جائزہ جو میں نے دنیا کی موجودہ اخلاقی حالت کا لیا ہے اس سے بہ یک نظر یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ دنیا میں اس وقت ایک ہمہ گیر اخلاقی انتشار پایا جاتا ہے۔ خدا سے بے نیاز ہو کر انسان کوئی ایسی بنیاد نہیں پا سکا جس پر وہ قابلِ اطمینان طریقے سے اپنے اخلاق کی تعمیر کرتا۔ اخلاق کے سارے بنیادی سوالات اس کے لئے حقیقتاً لاجواب ہو کر رہ گئے۔ نہ وہ اس خیرِ برتر کا کہیں سراغ لگا سکا جو اس کی کوششوں کا منتہا بننے کے قابل ہوتا اور جس کے لحاظ سے اعمال کے نیک یا بد اور صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا۔ نہ اسے وہ ماخذ کہیں ہاتھ لگا جس سے وہ صحیح طور پر معلوم کر سکتا کہ خیر کیا ہے اور شر کیا۔ نہ اسے وہ اقتدار فراہم کرنے میں کامیابی ہوئی جس کے امضاءت، خلاق کی کسی بلند، جامع اور عالمگیر ضابطہ کو قوتِ نفاذ حاصل ہوتی اور نہ اسے کوئی ایسا محرک مل سکا جو انسانوں میں راستی پر عمل کرنے اور ناراستی سے پرہیز کرنے کے لئے حقیقی آمادگی پیدا کرنے کے قابل ہو۔ خدا سے بغاوت کر کے انسان نے خودسری کے ساتھ ان سوالات کو حل کرنا چاہا اور اپنے نزدیک

حل کیا بھی، مگر یہ اسی حل کے پیدا کردہ نتائج ہیں جو آج ہم کو اخلاقی تنزل کے ایک خوفناک طوفان کی شکل میں اٹھتے اور پوری انسانی تہذیب کو تباہی کی دھمکیاں دیتے نظر آرہے ہیں۔

کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہم اس بنیاد کو تلاش کریں جس پر انسانی اخلاق کی صحیح تعمیر ہو سکے؟ فی الواقع یہ تلاش و جستجو محض ایک علمی بحث نہیں ہے بلکہ ہماری زندگی کی ایک عملی ضرورت ہے اور وقت کی نزاکت نے اس کو اہم ترین ضرورت بنا دیا ہے۔ اسی لحاظ سے میں اپنی تلاش کے نتائج پیش کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ جو لوگ اس ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں، وہ نہ صرف میرے ان نتائج پر ٹھنڈے دل سے غور کریں بلکہ خود بھی سوچیں کہ اخلاقِ انسانی کے لئے آخر کون سی بنیاد صحیح ہو سکتی ہے۔

میں اپنی تلاش و تحقیق سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ اخلاق کے لئے صرف ایک ہی بنیاد صحیح ہے اور وہ اسلام فراہم کرتا ہے یہاں فلسفۂ اخلاق کے تمام بنیادی سوالات کا جواب ہم کو ملتا ہے۔ اور ایسا جواب ملتا ہے جس کے اندر وہ کمزوریاں موجود نہیں ہیں جو فلسفیانہ جوابات میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں مذہبی اخلاقیات کی ان کمزوریوں میں سے بھی کوئی کمزوری موجود نہیں ہے جن کی وجہ سے

وہ نہ کسی مستحکم سیرت کی تعمیر کر سکتے ہیں اور نہ انسان کو تمدّن کی وسیع ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل بناتے ہیں۔ یہاں ایک ایسی ہمہ گیر اخلاقی رہنمائی ملتی ہے جو زندگی کے تمام شعبوں میں ترقّی کے انتہائی ممکن درجات تک ہمیں لے جا سکتی ہے۔ یہاں وہ اخلاقی اصول ہم کو ملتے ہیں جن پر ایک صالح ترین نظام تمدّن قائم ہو سکتا ہے اور اگر ان اصولوں پر انفرادی و اجتماعی کردار کی بنا رکھی جائے تو انسانی زندگی اس فساد سے محفوظ رہ سکتی ہے جس سے وہ اس وقت دوچار ہے۔ اس نتیجہ پر میں کن دلائل سے پہنچا ہوں؟ اس کی مختصر تشریح میں آپ کے سامنے بیان کروں گا۔

فلسفہ جس مقام سے اپنی اخلاقی بحث شروع کرتا ہے درحقیقت وہ اخلاق کے مسئلے کا سرا نہیں ہے بلکہ بیچ کے چند نقطے ہیں جنہیں سرے کو چھوڑ کر اُس نے نقطۂ آغاز بنا لیا ہے اور یہی اس کی پہلی غلطی ہے یہ سوال کہ انسان کے لئے کردار کی صحت و غلطی کا معیار کیا ہے اور وہ کون سی بھلائی ہے جس کو پہنچنے کی سعی انسان کے لئے مقصود بالذات ہونی چاہئے، دراصل یہ بعد کا سوال ہے، اس سے پہلے جو سوال حل ہونا چاہئے وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کی حیثیت کیا ہے۔ یہ سوال اس لئے تمام سوالات پر مقدّم ہے کہ حیثیت کے

تعین کے بغیر اخلاق کا سوال محض بے معنیٰ ہی نہیں ہو جاتا بلکہ اس بیں بیشتر امکان اسی امر کا ہوتا ہے کہ اس طرح جو اخلاقیات متعین کئے جائیں گے وہ بنیادی طور پر غلط ہوں گے. مثلاً کسی جائیداد کے متعلق آپ کو یہ طے کرنا ہے کہ اس میں کس طرح مجھے کام کرنا چاہئے اور کس قسم کے تصرفات میرے لئے حق ہیں اور کس قسم کے تصرفات باطل. کیا آپ اس سوال کو صحیح طور پر حل کر سکتے ہیں تاوقتیکہ پہلے اس بات کا تعین نہ کر لیں کہ اس جائیداد میں آپ کی حیثیت کیا ہے اور اس سے آپ کے تعلق کی کیا نوعیت ہے؟ اگر یہ جائیداد کسی دوسرے کی ملکیت ہے اور آپ اس میں امین کی حیثیت رکھتے ہیں تو آپ کے لئے اس میں اخلاقی طرزِ عمل کی نوعیت کچھ اور ہوگی اور اگر آپ خود اس کے مالک ہیں اور اس پر آپ کے مالکانہ اختیارات غیر محدود ہیں تو آپ کے اخلاقی طرزِ عمل کی نوعیت بالکل دوسری ہو جائے گی۔ اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ حیثیت کا سوال اخلاقی طرزِ عمل کی نوعیت کے معاملہ میں فیصلہ کن ہے، بلکہ درحقیقت اسی پر اس امر کے فیصلہ کا بھی انحصار ہے کہ اس جائیداد میں آپ کے لئے صحیح طرزِ عمل متعین کرنے کا حق دار کون ہے، آپ خود یا وہ جس کے آپ امین ہیں۔

اسلام سب سے پہلے اسی سوال کی طرف توجہ کرتا ہے اور ہمیں

بالکل واضح طور پر ہر شائبہ اشتباہ کے بغیر یہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کی حیثیت خدا کے بندے اور نائب کی ہے۔ یہاں انسان کو جتنی چیزوں سے سابقہ پیش آتا ہے، وہ سب خدا کی ملک ہیں، حتّٰی کہ انسان کا اپنا جسم اور وہ تمام قوتیں بھی جو اس جسم میں بھری ہوئی ہیں، انسان کی اپنی ملک نہیں ہیں بلکہ خدا کی ملک ہیں۔ خدا نے اس کو ان تمام چیزوں پر تصرف کرنے کے اختیارات دے کر یہاں اپنے نائب کی حیثیت سے مامور کیا ہے، اور اس ماموریت میں اس کا امتحان ہے۔ امتحان کا آخری نتیجہ اس دنیا میں نہیں نکلے گا بلکہ جب افراد کا، قوموں کا اور پوری نوعِ انسانی کا کام ختم ہو چکے گا اور انسانوں کی مساعی کے اثرات و نتائج پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیں گے، تب خدا ایک وقت ان سب کا حساب لے گا۔ اور اس امر کا فیصلہ کرے گا کہ کس نے اس کی بندگی اور نیابت کا حق ٹھیک ادا کیا ہے اور کس نے نہیں کیا ہے۔ یہ امتحان کسی ایک امر میں نہیں بلکہ تمام امور میں ہے۔ کسی ایک شعبۂ زندگی میں نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی پوری زندگی میں ہے۔ نفس و جسم کی جتنی قوتیں انسان کو دی گئی ہیں سب کا امتحان ہے اور خارج میں جن جن چیزوں پر جس جس طرح کے اختیارات اسے عطا کیے گئے ہیں، ان سب میں بھی امتحان ہے کہ وہ کس طرح ان پر اپنا

اختیار استعمال کرتا ہے۔

حیثیت کے اس تعین کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں اپنے لئے اخلاقی طرزِ عمل کے تعین کا حق ہی سرے سے انسان کو حاصل نہیں رہتا بلکہ اس کا فیصلہ کرنا خدا کا حق ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد فلسفۂ اخلاق کے وہ تمام سوالات جن کو فلسفیوں نے چھیڑا ہے، نہ صرف یہ کہ حل ہو جاتے ہیں بلکہ اس امر کی بھی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ایک ایک سوال کے چھتیس چھتیس جوابات ہوں اور ایک ایک جواب پر انسانوں کا ایک ایک گروہ اخلاق کے ایک جداگانہ رُخ پر چل پڑے اور ایک ہی تمدّنی و اجتماعی زندگی میں رہتے ہوئے یہ مختلف سمتوں پر چلنے والے لوگ اپنی بے راہ رویوں سے بدنظمی، انتشار اور فساد برپا کریں اگر انسان کی اس حیثیت کو تسلیم کیا جائے جو اسلام نے قرار دی ہے تو یہ بات خود متعین ہو جاتی ہے کہ خدا کے امتحان میں کامیاب ہونا اور اس کی رضا کو پہنچنا ہی وہ بلند ترین بھلائی ہے جو مقصودِ بالذات ہونی چاہیئے، اور کسی طرزِ عمل کے صحیح یا غلط ہونے کا مدار اسی امر پر ہے کہ وہ اس بھلائی کے حصول میں کہاں تک مددگار یا مانع ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی یہیں سے متعین ہو جاتی ہے کہ انسان کے لئے نیک اور بد، صحیح اور غلط کے علم کا اصل مآخذ خدا کی ہدایت ہے اور اس کے سوا دوسرے

ذرائعِ علم اس اصل مآخذ کے مددگار تو بن سکتے ہیں مگر خود اصل مآخذ نہیں بن سکتے۔ نیز یہ کہ قانونِ اخلاق کے لئے اصل امضاء (SANCTION) خدا کی ہے، اور یہ بھی کہ اچھے اخلاق کی پابندی اور بُرے اخلاق سے اجتناب کے لئے اصل محرّک خدا کی محبت، اس کی رضا کی طلب اور اس کی ناراضی کا خوف ہونا چاہیئے۔

پھر نہ صرف یہ کہ اس سے فلسفۂ اخلاق کے سارے اصولی سوالات حل ہو جاتے ہیں بلکہ درحقیقت اس بنیاد پر جو اخلاقی سسٹم بنتا ہے اس کے اندر نہایت متوازن اور متناسب طریقے سے وہ تمام اخلاقی سسٹم اپنی اپنی موزوں جگہ لیتے ہیں جو فلسفۂ اخلاق کے مفکرین نے تجویز کئے ہیں۔ فلسفیانہ اخلاقی نظاموں کی اصل قباحت یہ نہیں ہے کہ ان میں حقیقت و صداقت کا کوئی جزو بھی نہیں ہے بلکہ ان کی اصل قباحت یہ ہے کہ انھوں نے صداقت کے ایک جزو کو لے کر پوری صداقت بنا لیا ہے اس لئے جزو کے کُل بننے میں جس قدر زائد کی ضرورت پڑتی ہے اس کی تکمیل کے لئے لامحالہ انھیں باطل کے بہت سے اجزاء لینے پڑتے ہیں۔ اسلام اس کے برعکس پوری صداقت پیش کرتا ہے اور اس کل صداقت میں وہ تمام جزئی صداقتیں جذب ہو جاتی ہیں جو لوگوں کے پاس الگ الگ تھیں اور ناقص تھیں۔ یہاں

خوشی کا بھی ایک مقام ہے، مگر اس سے مراد وہ خوشی و خوش حالی ہے جو خدا کے قانون کی پیروی سے اور اس کے نتیجہ میں حاصل ہو اور یہ خوشی و خوش حالی جسمانی و مادّی بھی ہے، ذہنی و نفسی بھی، آرٹسٹک اور روحانی بھی۔ نیز یہ خوشی و خوش حالی فرد کی بھی ہے، جماعت کی بھی اور تمام انسانیت کی بھی۔ ان مختلف خوشیوں میں تصادم نہیں بلکہ توافق ہے۔ یہاں کمال کا بھی ایک مقام ہے، مگر وہ کمال جو خدا کے امتحان میں سو فی صدی نمبر پانے کا مستحق ہو۔ اور یہ فرد کا، جماعت کا، قوم کا، پوری انسانیت کا، غرض سب ہی کا کمال ہے۔
صحیح اخلاقی طرزِ عمل وہ ہے جس سے ہر فرد نہ صرف خود کمال کی طرف ترقی کرے بلکہ دوسروں کی تکمیل میں بھی مددگار ہو اور کوئی کسی کی تکمیل میں مزاحم نہ ہو۔ یہاں کانٹ کے "قطعی واجب الاطاعت" (CATEGORICAL IMPERATIVE) کو بھی پوری عزت کی جگہ مل جاتی ہے، اور اس جہاز کو وہ لنگر بھی مل جاتا ہے جس کے بغیر یہ فلسفہ کے دریا میں ڈگمگا رہا تھا۔ جس قطعی واجب الاطاعت قانون کا ذکر کانٹ نے کیا ہے اور جس کی وہ خود کوئی توضیح نہ کر سکا دراصل وہ خدا کا قانون ہے، خدا ہی کی طرف سے اس کی صورت معیّن کی گئی ہے، خدا ہی کا قانون ہونے کی وجہ سے وہ واجب الاطاعت

ہے، اور اسی کی بے چون وچرا اطاعت کا نام نیکی ہے۔ اسی طرح یہاں
اخلاقی خیر و شر کے علم کا جو ماخذ ہمیں بتایا گیا ہے وہ ان دوسرے ذرائعِ علم
کی نفی نہیں کرتا جن کی طرف فلاسفہ رجوع کرتے ہیں بلکہ ان سب کو
ایک سسٹم کا جزو بنا لیتا ہے، البتہ وہ نفی جس چیز کی کرتا ہے وہ صرف یہ
بات ہے کہ انھیں یا ان میں سے کسی ایک کو اصلی اور آخری ذریعۂ
علم کی حیثیت سے لے لیا جائے، خدا کی ہدایت کے ذریعہ سے خیر و
شر کا جو علم ہمیں بخشا گیا ہے وہ اصل علم ہے اور تجربی علم، قوانینِ حیات
اور حالاتِ وجود سے استنباط کیا ہوا علم، عقلی علم، اور وجدانی علم، یہ سب
اس کے شواہد ہیں۔ جن چیزوں کو خدا کی ہدایت خیر کہتی ہے، انسانیت
کا تجربہ ان کے خیر ہونے پر شہادت دیتا ہے، قوانینِ حیات اس کی تصدیق
کرتے ہیں عقل اور وجدان دونوں اس پر گواہ ہیں۔ لیکن معیارِ صداقت
خدائی ہدایت ہے نہ کہ یہ ذرائعِ علم، انسانیت کے تاریخی تجربات سے،
یا قوانینِ حیات سے اگر کوئی ایسا استنباط کیا جائے یا عقل و وجدان سے
کوئی ایسی رائے قائم کی جائے جو خدا کی ہدایت کے خلاف ہو تو اصل اعتبار
خدا کی ہدایت کا کیا جائے گا نہ کہ اس استنباط یا اس رائے کا۔ ہمارے پاس علم کا ایک مستند
معیار ہونیکا فائدہ ہی یہ ہے کہ ہمارے علوم ڈسپلن پیدا ہو اور ہم اس انار کی اور بدنظمی
سے بچ جائیں جو کسی معیار کے نہ ہونے اور اعجاب علیٰ کل ذی

راہی بدایۃ سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح یہاں قانونِ اخلاق کی پشتیبان قوت (SANCTION) اور محرکات کا مسئلہ بھی اس طور پر حل ہوتا ہے کہ اس سے ان دوسری چیزوں کی نفی نہیں ہوتی جو فلسفیوں نے تجویز کی ہیں بلکہ صرف ان کی تصحیح ہو جاتی ہے اور جن غلط حدود پر وہ پھیلا دی گئی ہیں یا خود پھیل جاتی ہیں وہاں سے ان کو ہٹا کر ایک جامع سسٹم میں ٹھیک مقام پر رکھ دیا جاتا ہے۔ خدا کا قانون اس لئے کہ وہ خدا کا قانون ہے، اپنے قیام کی طاقت آپ اپنے اندر رکھتا ہے، اور یہ طاقت اس مومن کے نفس میں بھی موجود ہے جو خدا کی رضا چاہنے میں خوشی محسوس کرتا ہے اور خود اس کمال کا طالب ہے جو خدا کی طرف بڑھنے سے حاصل ہو، نیز یہ طاقت مومنین کی سوسائٹی اور اس صالح ریاست میں بھی موجود ہے جو خدا کے قانون پر مبنی ہو۔ قانون کی پابندی پر مومن کو آمادہ کرنے والی چیز اس کی خالص فرض شناسی بھی ہے، اس کا حق کو حق جانتے ہوئے اسے پسند کرنا اور باطل کو باطل سمجھتے ہوئے اس سے نفرت کرنا بھی ہے۔ اور وہ طمع اور خوف بھی ہے جو وہ اپنے خدا سے رکھتا ہے۔

دیکھئے اس طرح اسلام اس پوری فکری اور عملی انارکی کو ختم کر دیتا ہے جو انسان کو بے خدا فرض کر کے اس کے لئے ایک نظام

اخلاق تجویز کرنے کی کوششوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد آگے چلئے۔ اسلام خدا کا جو تصور پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا ہی انسان کا اور ساری کائنات کا واحد مالک، خالق، معبود اور حاکم ہے۔ اس خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ اس کے ہاں بجز دعائے خیر کے کسی ایسی سفارش کی گنجائش بھی نہیں جو زور سے منوائی جاتی ہو اور رد نہ کی جا سکتی ہو۔ اس کے ہاں ہر شخص کی کامیابی و ناکامی کا مدار اس کے اپنے طرزِ عمل پر ہے، نہ کوئی کسی کا کفارہ بن سکتا ہے نہ کسی کے عمل کی ذمہ داری دوسرے پر ڈالی جاتی ہے، اور نہ کسی کے عمل کا صلہ دوسرے کو ملتا ہے۔ اس کے ہاں جانب داری نہیں کہ ایک شخص یا خاندان یا قوم یا نسل سے اس کو دوسرے کی بہ نسبت زیادہ دلچسپی ہو۔ سب انسان اس کی نگاہ میں یکساں ہیں، سب کے لئے ایک ہی قانونِ اخلاق ہے، اور فضیلت جو کچھ بھی ہے اخلاقی فضیلت کے اعتبار سے ہے وہ خود رحیم ہے اور رحم کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود فیاض ہے اور فیاضی کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود غفور ہے اور درگذر کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود عادل ہے اور عدل کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود ظلم سے، تنگ نظری و تنگ دلی سے، بے رحمی و سنگ دلی سے، تعصب اور نفسانی جانب داری سے پاک ہے اس لئے انہی کو پسند کرتا ہے

جوان صفات سے پاک ہوں۔ پھر کبریائی تنہا اسی کا حق ہے اس لئے تکبر اسے ناپسند ہے۔ خدائی صرف اس کے لئے ہے اور دوسرے اس کے بندے ہیں، اس لئے ایک بندے پر دوسرے کی خداوندی اس کو پسند نہیں۔ مالک وہ اکیلا ہے اور دوسروں کے پاس جو کچھ ہے امانت کی حیثیت سے ہے، اس لئے کسی بندے کی خودمختاری اور کسی کا کسی کے لئے قانون بنانا اور کسی کا کسی کے لئے بذات خود واجب الاطاعت ہونا یہ سب فی الحقیقت غلط ہے۔ سب کا مطاع وہی ایک ہے اور سب کے لئے خیر اسی میں ہے کہ اس کی بے چون وچرا اطاعت کریں۔ پھر وہ محسن ہے اور شکر، احسان مندی اور محبت کا مستحق ہے۔ وہ منعم ہے اور اس کا حق دار ہے کہ اس کی نعمتوں میں اسی کے منشار کے مطابق تصرف کیا جائے۔ وہ منصف ہے اور لازم ہے کہ انسان اس کے انصاف میں سزا پانے کا خوف اور جزا پانے کی طمع رکھے۔ وہ علیم وخبیر ہے اور دلوں کی چھپی ہوئی نیتوں سے بھی واقف ہے۔ اس لئے ظاہری حسنِ اخلاق سے اس کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ وہ محیط ہے اس لئے کوئی یہ امید بھی نہیں کر سکتا کہ جرم کر کے اس کی پکڑ سے بچ نکلے گا۔

خدا کے اس تصور پر غور کیجئے، اس سے خود بخود ایک فطری

نتیجہ کے طور پر انسان کے لئے ایک مکمل اخلاقی زندگی کا نقشہ وجود میں آتا ہے اور وہ نقشہ ان تمام کمزوریوں سے خالی ہے جو مشرکانہ مذاہب کے اخلاقیات اور دہریانہ مسلکوں کے اخلاقیات میں پائے جاتے ہیں یہاں نہ تو اخلاقی ذمہ داریوں سے بچ نکلنے کے لئے چور دروازے کہیں موجود ہیں، نہ ان ظالمانہ فلسفوں کے لئے کوئی جگہ ہے جن کی بناء پر انسان اپنی دلچسپیوں کے لحاظ سے عالمِ انسانیت کو تقسیم کر کے ایک حصّہ کے لئے مجسّم فرشتہ اور دوسرے حصّہ کے لئے مجسّم شیطان بن جاتا ہے۔ نہ دہری اخلاقیات کی وہ بنیادی کمزوریاں اس میں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے اخلاق میں کوئی استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔ ان سلبی خوبیوں کے ساتھ اس نقشہ میں یہ ایجابی خوبی موجود ہے کہ یہ اخلاقی فضیلت کا ایک بلند ترین اور وسیع ترین منتہا پیش کرتا ہے جس کی وسعت اور بلندی کی کوئی حد نہیں اور اس منتہا کی طرف بڑھنے کے لئے ایسے محرکات فراہم کرتا ہے جو پاکیزہ ترین ہیں

پھر یہ تصور کہ امتحان کسی ایک چیز میں نہیں بلکہ ان تمام چیزوں میں ہے جو خدا نے انسان کو دی ہیں، کسی ایک حیثیت میں نہیں بلکہ ان تمام حیثیتوں میں ہے جو انسانوں کو یہاں حاصل ہیں اور کسی ایک شعبہ میں نہیں بلکہ پوری زندگی میں ہے۔ یہ اخلاق کے دائرے کو اتنا ہی پھیلا دیتا

ہے جتنا امتحان کا دائرہ پھیلا ہوا ہے، انسان کی عقل، اس کے ذرائعِ علم، اس کی ذہنی و فکری قوتیں، اس کے حواس، اس کے جذبات، اس کی خواہشات، اس کی جسمانی طاقتیں سب کی سب امتحان میں شریک ہیں، یعنی امتحان آدمی کی پوری شخصیت کا ہے پھر خارج کی دنیا میں جن جن اشیاء سے آدمی کو سابقہ پیش آتا ہے، جن اشیا پر وہ تصرف کرتا ہے، جن انسانوں سے مختلف طور پر اس کو واسطہ پڑتا ہے، ان سب کے ساتھ اس کے برتاؤ میں امتحان ہے، اور سب سے بڑھ کر اس امر میں امتحان ہے کہ انسان یہ سب کچھ خدا کی خداوندی اور اپنی عبدیت دنیابت کے احساس کے ساتھ کر رہا ہے یا آزادی و خودمختاری کی ہوا میں مبتلا ہو کر؟ یا خدا کے سوا دوسروں کا بندہ بن کر؟ اس وسیع ترین تصور اخلاق میں وہ تنگی نہیں ہے جو مذہب کے محدود تصور سے پیدا ہوتی ہے، یہ آدمی کو زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھاتا ہے، ہر میدان کی اخلاقی ذمہ داریاں اسے بتاتا ہے، اور وہ اخلاقی اصول اسے دیتا ہے جن کی پیروی کرنے سے وہ خدا کے اس امتحان میں کامیاب ہو سکے جو ایک ایک میدانِ زندگی سے متعلق ہے۔

پھر یہ تصور کہ امتحان کا اصلی اور آخری فیصلہ اس زندگی

میں نہیں بلکہ دوسری زندگی میں ہوگا اور حقیقی کامیابی وناکامی وہ ہے جو وہاں ہو نہ کہ یہاں، یہ دنیا کی زندگی اور اس کے معاملات پر انسان کی نظر (OUT LOOK) کو بنیادی طور پر بدل دیتا ہے۔ اس تصور کی وجہ سے وہ نتائج جو اس دنیا میں نکلتے ہیں ہمارے لئے حسن و قبح، صحت اور غلطی، حق اور باطل، اور کامیابی وناکامی کے قطعی اصلی اور آخری معیار نہیں رہتے، اس لئے قانونِ اخلاق کی پیروی کرنے یا نہ کرنے کا انحصار بھی ان نتائج پر نہیں ہو سکتا۔ جو شخص اس تصور کو قبول کرلے گا وہ قانونِ اخلاق کی پیروی پر بہر حال ثابت قدم رہے گا خواہ اس دنیا میں اس کا نتیجہ بظاہر اچھا ہو یا برا، کامیابی کی صورت میں نکلتا نظر آئے یا ناکامی کی صورت میں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کی نگاہ میں دنیوی نتائج بالکل ہی ناقابلِ لحاظ ہوں گے، بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ اصلی اور آخری لحاظ ان کا نہیں بلکہ آخرت کے پائیدار نتائج کا کرے گا اور اپنے لئے صحیح صرف اس طرزِ عمل کو سمجھے گا جو ان نتائج پر نگاہ رکھتے ہوئے اختیار کیا جائے۔ وہ کسی چیز کو چھوڑنے اور کسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ اس بنیاد پر نہیں کرے گا کہ زندگی کے اس ابتدائی مرحلہ میں وہ لذت اور خوشی اور نفع کی موجب ہے یا نہیں بلکہ اس بنیاد پر کرے گا کہ زندگی کے آخری مرحلہ میں اپنے قطعی

دحتمی نتائج کے اعتبار سے وہ کیسی ہے۔ اس طرح اس کا نظام اخلاق ترقّی پذیر تو ضرور رہے گا مگر اس کے اصول اخلاق تغیر پذیر نہ ہوں گے اور نہ ان کی سیرت ہی تلوّن پذیر ہو گی۔ یعنی تمدن و تہذیب کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ اس کے اخلاقی تصورات میں وسعت تو یقیناً ہو گی مگر یہ ممکن نہ ہو گا کہ واقعات کی ہر کروٹ اور حالات کی ہر گردش کے ساتھ اخلاق کے اصول بھی بدلتے چلے جائیں اور آدمی ایک اخلاقی گرگٹ بن کر رہ جائے کہ اس کے اخلاقی رویہ میں سرے سے کوئی پائداری ہی نہ ہو۔

پس اخلاق کے نقطۂ نظر سے آخرت کا یہ اسلامی تصوّر دو اہم فائدے عطا کرتا ہے جو کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ ایک یہ کہ اس سے اصولِ اخلاق کو غایت درجہ کا استحکام نصیب ہوتا ہے جس میں تنزّل کا کوئی خطرہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس سے انسان کی اخلاقی سیرت کو وہ استقامت میسر آتی ہے جس میں بالشرطِ ایمان انحراف کا کوئی اندیشہ نہیں۔ دنیا میں سچائی کے دس مختلف نتیجے نکل سکتے ہیں اور ان نتائج پر نگاہ رکھنے والا ایک ابن الوقت انسان موقع اور امکانات کے لحاظ سے دس مختلف طرزِ عمل اختیار کر سکتا ہے، لیکن آخرت میں سچائی کا نتیجہ لازماً ایک ہی ہے اور اس پر نظر رکھنے والا

ایک مومن انسان دنیوی فائدے اور نقصان کا لحاظ کئے بغیر لازماً ایک ہی طرزِ عمل اختیار کرے گا، دنیوی نتائج کا اعتبار کیجئے تو خیر و شر کسی متعین چیز کا نام نہیں رہتا بلکہ ایک ہی چیز اپنے مختلف نتیجوں کے لحاظ سے کبھی خیر اور کبھی شر بنتی رہتی ہے اور اس کے اتباع میں دنیا پرست آدمی کا کردار بھی اپنی پوزیشن تبدیل کرتا رہتا ہے، لیکن آخرت کے نتائج پر نظر رکھئے تو خیر اور شر دونوں قطعی طور پر متعین ہو جاتے ہیں اور مومن بالآخرۃ آدمی کے لئے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ کبھی خیر کو بد انجام یا شر کو نیک انجام سمجھ کر اپنے کردار کو بدل دے۔

پھر یہ تصور کہ انسان اس دنیا میں خدا کا خلیفہ ہے اور تصرف کے جو اختیارات اسے حاصل ہیں وہ سب دراصل نائبِ خدا ہونے کی حیثیت سے ہیں، انسانی زندگی کے لئے راستے اور مقصد دونوں کا تعین کر دیتا ہے۔ اس تصور سے لازم آتا ہے کہ انسان کے لئے خود مختارانہ رویہ اور بندگی غیر اور خداوندانہ بڑائی کے تمام رویے غلط ہوں اور صرف یہی ایک رویہ صحیح ہو کہ اپنے تمام تصرفات میں وہ خدا کی مرضی کا تابع اور اس کے نازل کردہ اخلاقی قانون کا پابند بن کر رہے۔ نیز اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ انسان ایک طرف تو

اپنے اخلاقی رویہ میں ہر ایسے طرزِ عمل سے بہ شدت اجتناب کرے جس میں
خود مختاری و بغاوت کا، یا خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کا یا خداوندانہ کبریائی
کا ذرہ برابر شائبہ پایا جاتا ہو، کیونکہ یہ تینوں چیزیں اس کی نائبانہ حیثیت
کے منافی ہیں، مگر دوسری طرف خدا کی املاک میں اس کا تصرف اور
خدا کی پیدا کردہ قوتوں میں اس کا برتاؤ، اور خدا کی رعیت میں اس
کی فرماں روائی اس اخلاق اور اس برتاؤ کے عین مطابق ہو جو اس
سلطنت کا اصل مالک اپنے ملک، اور اپنی رعیت میں اختیار کر رہا ہے
کیونکہ نائبانہ حیثیت کا فطری اقتضا یہی ہے کہ نائبِ سلطان کی پالیسی خود
سلطان کی پالیسی سے اور نائب سلطان کے اخلاق خود سلطان کے اخلاق
سے منافی نہ ہوں۔ نیز اس تصور سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ جو قوتیں اللہ
نے انسان کو عطا کی ہیں اور جو ذرائع اور وسائل اسے دنیا میں بخشے
ہیں، ان سب کو استعمال کرنے اور منشار الٰہی کے مطابق استعمال کرنے پر
انسان مامور ہو، یعنی دوسرے الفاظ میں وہ نائب سلطان بھی سخت مجرم
ہو، جس نے سلطان کے منشار کے خلاف اس کی ملک اور اس کی رعیت
میں تصرف کیا، اور اسی طرح وہ نائب بھی بڑا مجرم قرار پائے جس نے سلطان
کے دیئے ہوئے اختیارات میں سے کسی اختیار کو سرے سے استعمال ہی نہ کیا
ہو، اس کی بخشی ہوئی قوتوں میں سے کسی قوت کو بلا وجہ ضائع کیا ہو، اس کے

بنائے ہوئے ذرائع و وسائل سے کام لینے میں جان بوجھ کر کوتاہی کی ہو، اور اس ڈیوٹی سے منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا ہو جس پر سلطان نے اسے مامور کیا تھا، نیز اس تصوّر سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ پوری نوعِ انسانی کی اجتماعی زندگی ایسے ڈھنگ پر قائم ہو کہ سارے انسان، یعنی خدا کے سب خلیفہ ان ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں جو خدا نے ان پر عائد کی ہیں، ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہوں اور نظامِ تمدّن و عمران میں ایسی کوئی چیز کارفرما نہ رہے جس کی وجہ سے ایک انسان دوسرے انسان کی یا انسانوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ کی خلافت کو عملاً سلب کر لے یا اس کے اجراء میں مانع و مزاحم ہو، بجز اس صورت کے جب کہ کوئی انسان یا گروہِ انسانی خلافت سے محروم ہو کر اپنے حقیقی سلطان سے بغاوت کا مرتکب ہو رہا ہو۔

یہ تو ہے وہ اخلاقی منہاج جو تصوّرِ خلافت سے ایک لازمی نتیجہ کے طور پر انسان کے لئے بنتی ہے۔ رہا انسان کی اخلاقی زندگی کا مقصد اور اس کی تمام سعی و عمل کا نصب العین تو وہ بھی اسی تصوّر سے بالکل ایک منطقی لزوم کے ساتھ متعین ہو جاتا ہے۔ نائب سلطان کی حیثیت سے انسان کا زمین پر مامور ہونا خود بخود اس بات کا مقتضی ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد زمین پر خدا کی مرضی پوری کرنے کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ خدا نے زمین کے انتظام کا جتنا حصّہ انسان سے متعلّق کیا ہے اس حصّہ میں خدا کے قانون

کو جاری کرنا، خدا کے منشار کے مطابق امن اور عدل اور صلاح کا نظام قائم کرنا اور قائم رکھنا، اس نظام میں شر و فساد کی جو جو صورتیں شیاطینِ جنّ وانس پیدا کریں ان کو دبانا اور مٹانا، اور ان بھلائیوں کو زیادہ سے زیادہ نشو و نما دینا جو خدا کو محبوب ہیں اور جن سے خداوند عالم اپنی زمین اور اپنی رعیت کو آراستہ دیکھنا چاہتا ہے، یہ ہے وہ مقصد جس پر ہر وہ انسان اپنی تمام مساعی کو مرکوز کر دے گا جس کے اندر خلیفۂ الٰہی ہونے کا شعور بیدار ہو چکا ہو۔ یہ مقصد صرف یہی نہیں کہ ان تمام مقاصد کی نفی کر دیتا ہے جو لذت پرستوں، مادہ پرستوں، قوم پرستوں اور دوسرے مہملات کے پرستاروں نے اپنی زندگی کے لئے مقرر کئے ہیں، بلکہ ان لایعنی مقاصد کی بھی اتنی ہی شدت کے ساتھ نفی کرتا ہے جو روحانیت کے ایک غلط تصور کے تحت اہلِ مذاہب نے متعین کئے ہیں۔ ان دونوں غلط انتہاؤں کے درمیان خلافتِ الٰہیہ کا تصور انسان کے سامنے ایک ایسا بلند ترین اور پاکیزہ ترین مقصدِ حیات رکھ دیتا ہے جو اس کی ساری قوتوں اور قابلیتوں کو زندگی کے ہر میدان میں برسرِ کار لاتا ہے اور انھیں ایک صالح ترین نظامِ تہذیب و تمدن کے قیام و ارتقا کی خدمت میں استعمال کرتا ہے۔

یہ ہیں وہ بنیادیں جو اخلاقِ انسانی کی تعمیر کے لئے اسلام نے ہم کو دی ہیں۔ اسلام کسی ایک قوم کی جائداد نہیں بلکہ تمام انسانیت کی مشترک

میراث ہے اور سارے انسانوں کی فلاح اس کے پیشِ نظر ہے۔ اس لئے
ہر اس شخص کو جو اپنی اور انسانیت کی فلاح کا خواہش مند ہو، یہ سوچنا چاہئے
کہ آیا انسانی اخلاق کی تعمیر کے لئے یہ بنیادیں بہتر ہیں جو اسلام ہمیں دے
رہا ہے یا وہ جو روحانی مذاہب یا فلسفیانہ مسالک ہم کو دیتے ہیں؟ اگر کسی
کا دل گواہی دے کہ اخلاق کے لئے یہی بنیادیں صحیح تر ہیں تو پھر کوئی جاہلانہ
تعصب اسے ان بنیادوں کو قبول کر لینے میں مانع نہ ہونا چاہئے۔

اسلام

کے بارے میں صحیح معلومات بہم پہنچانے والی اور خالص اسلامی فکر کو بیدار کرنے والی مزید کتب کے مطالعہ اور مشورے کے لئے ذیل کے پتے پر مراسلت کیجئے۔ ہمارا لٹریچر مسلموں اور غیر مسلموں کے لئے یکساں مفید ہے۔

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

ہماری چند مطبوعات

اسلام ایک نظر میں

اسلام اور اجتماعیت

عورت اسلامی معاشرہ میں

انسان اور اس کے مسائل

فریضۂ اقامت دین

اسلام اور ضبطِ ولادت

پردہ

حقوق الزوجین

رسالۂ دینیات

مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے

سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ

فرقہ وارانہ فسادات کا مسئلہ